پاکستان میں بڑھتے ہوئے سیکولر رجحانات اسباب و اثرات کا تجزیاتی مطالعہ

Analytical Study of Increasing Secular Trends: Causes and Effects in Pakistani Society

ڈاکٹر آسیہ شبیر*

ABSTRACT

In all Muslim societies, discussion about secularism has adopted vivid tussle of real life, which is affecting every field of life. Once, it used to be a trend and fashion of aristocracy in Pakistan, but now, it is knocking at the door of common man & new generation is becoming its victim.

Islam and secularism are two contradictory ideologies which cannot be patched up together. In every field of life, Islam demands complete submission to the 'revealed Hidayah' without infidelity. On the other hand, secularism has unveiled itself, letting go of any level of forbearance and tolerance for Islam. Even in Pakistan, a country with more than ninety percent Muslim population, secularism is challenging religious values, legitimacy and laws very boldly. Whether it is about Islamic rites and rituals, or rulings for family and social life, a matter of national dignity or Islamic concept of a Muslim ummah, interest prohibition in Islamic economic system or pre-requisition of integrity and trustworthiness in politics, the instigators of secular school of thought in Pakistan will always be at pursuit of Islamic ideology, attacking its every aspect. This poisoned atmosphere is catastrophic for young generation who will have the responsibility to protect this God gifted state in future. Pakistan was founded on the basis of *La ilaahaillallah.* Numerous Muslims sacrificed their lives, wealth and honor for it. The poisonous race belonging to secular school of thought is neither playing their role in achieving objectives of its establishment, nor its geographical protection.

This dissertation discusses the factors which are responsible for the current situation. The most important factor is negligence of our political leadership. Even after passing the Objectives Resolution, we could not mold our laws according to Islam. Second important factor is our educational syllabus. All over the world, secularism has been introduced into the system as well as educational syllabus but we could not give this place to Islam in our Islamic state. As a result, today, a secular generation has been seeded and nourished in our educational institutions. Third factor which can't be ignored is short sightedness of the Muslim scholars. The jurisprudential and sectarian differences which were no less than blessings

* ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی، لاہور

and beauty of the religious diversity, have now become the basis of discord, opposition & dispersion. There are no efforts to make the public aware about the wisdom behind strategies of Islamic laws and their beneficial consequences. In this article, analytical study of factors and consequences of promulgation of secularism as well as probable solutions of the problems and recommendations are discussed.

Keywords: Secularism, Pakistan, causes, effects, Islamic ideology, educational system, Objectives Resolution, clergy role.

دنیا بھر کے مسلم معاشروں میں سیکولرازم، آج صرف نظری بحثوں کا موضوع نہیں رہ گیا، بلکہ حقیقی زندگی کی واضح کشمکش کا عنوان بن چکا ہے۔ پاکستان میں کبھی یہ صرف مغربی تہذیب وثقافت سے متاثر اشرافیہ (Eliteclass) کا رجحان اور فیشن تھا لیکن آج بوجوہ، یہ عام آدمی کے دروازے پر دستک دے رہا ہے اور نئی نسلوں کے دل ودماغ، دونوں کا شکار کر رہا ہے۔

حقیقت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اسلام اور سیکولرازم، دو بالکل متضاد اور متحارب نظریات ہیں، جن کا ایک دوسرے میں پیوند لگانا ممکن نہیں ہے۔ اسلام اپنے پیروکاروں سے زندگی کے ہر شعبے میں، بلاشرکتِ غیرے، الہامی ہدایت کی پیروی کا مطالبہ کرتا ہے۔﴿ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَافَّةً﴾[1] دوسری طرف سیکولرازم کے لغوی معنی ہوں یا اصطلاحی مفہوم، دین اور مذہب کو اجتماعی زندگی سے پوری طرح بے دخل کرنے کا مطالبہ پوری طرح موجود ہے۔[2] اولاً مغربی معاشروں میں اور بعد ازاں مسلمانوں کے ہاں اس فکر کو رواداری، برداشت، وسعتِ ظرف اور تکثیریت (Pluralism) کے لبادوں میں چھپا کر پیش کیا گیا تھا لیکن آج، مشرق ومغرب میں سیکولرازم نے اپنے چہرے سے یہ نقاب الٹ دیا ہے۔ مغرب اپنے نام نہاد سیکولر معاشرے میں سکارف، حجاب اور کسی مسجد کی چھت پر ایک چھوٹے سے مینار کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔[3] ادھر مملکتِ خداداد پاکستان میں سیکولر مغربی فکر کے خوشہ چین ہر دینی حکم، قدر اور روایت کو چیلنج کر رہے ہیں۔ نام نہاد "رواداری" برائے شعائرِ کفر اختیار کرنے کا یہ مطالبہ اس ملک میں کیا جا رہا ہے جہاں ۹۶ فی صد سے زیادہ مسلمان بستے ہیں اور pew ریسرچ سنٹر کی رپورٹ کے مطابق ان میں سے ۸۴ فی صد آج بھی اسلامی شریعت کے نفاذ کے خواہاں ہیں۔[4]

اس ملک میں ابتدا ہی سے سیکولرازم کے حامی اقلیت میں رہے، لیکن یہ اقلیت کلیدی مناصب اور ابلاغی مصادر پر قابض ہونے کی وجہ سے پاکستان کی پوری تاریخ میں بڑی بے باکی کے ساتھ ہر دینی تصور کے درپے رہی ہے۔ آج اس کے فکری حملوں میں نہ صرف شدت آئی ہے بلکہ عمومی معاملات میں بھی "شدت پسندی" کا رجحان بڑا واضح اور نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔ شعائرِ دین اسلام ہوں یا خاندانی زندگی کے دینی ضابطے، امت کا اسلامی تصور ہو یا ملی غیرت ووقار کی بات، اسلام کے نظامِ معیشت میں سود کی حرمت ہو یا سیاسی مناصب کے لیے امانت ودیانت کے دینی

---

(۱) سورۃ البقرۃ:۲۰۸

(2) www.collinsidictionary.com/dictionary/english/secularism

(۳) اس معاملے پر بحث تو عرصے سے جاری تھی، لیکن ۲۰۰۳ء سے کئی مغربی ممالک میں باقاعدہ حجاب اور اسلامی شعائر کے خلاف قانون سازیوں کا بھی آغاز ہو چکا ہے۔

Burqa bans, headscarves and veils: A time line of legislation in the west.www.theguardian.com

(4) www.pewresearch.org.//fact tank/2017/05/26/muslims.and.islam.key.findings.in.the.US.and.around.the.world

تقاضے، سیکولرازم کے پاکستانی داعی پورے معاشرے کو دین کے حوالے سے چیلنج کرنے کے لیے ہر محاذ پر سرگرم عمل ہیں۔ یہ کسی ادارے میں بیٹھے ہوں، یا سوشل، پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر، ہر جگہ جارحانہ انداز میں اپنی فکر عوام الناس پر زبردستی مسلط کرنے کے لیے ہر لمحہ مستعد رہتے ہیں۔ پاکستان کی انگریزی صحافت شروع سے ہی اس فکر کی سرپرستی اور ترویج کے لیے شہرت رکھتی تھی۔ وہاں آج بھی سیکولرازم کے فرغ کے لیے کھل کر بحث ہوتی ہے اور اس حوالے سے خبریں، تبصرے اور تجزیے مستقل موضوعات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسی تحریروں پر تبصرے کرنے والے ان کے متبعین مشورے دیتے ہیں کہ:

> "Please try to print it in urdu and other local languages for the masses"(1)

یہ انگریزی خوان شاید یہ نہیں جانتے کہ اردو صحافت کا بھی آج یہی رنگ ورخ ہے۔ ہر کالم کا موضوع یہ ہے کہ ہماری پس ماندگی کی اصل وجہ فرسودہ اور "چودہ سو سال پرانے" مذہبی تصورات سے چمٹے رہنا ہے اور ترقی کی راہ کا پہلا قدم سیکولرازم کا جی جان سے نفاذ ہے یہ جو ہم آدھے ادھورے سیکولر نظام کے تحت اس ملک کا کاروبار چلا رہے ہیں، اس سے کام نہیں بن رہا۔

نسل نو کی ذہنی تخریب

آج کی نئی نسل کا زیادہ وقت یا تو تعلیم گاہوں میں گزرتا ہے، یا میڈیا کی رفاقت میں۔ ان دونوں اداروں کی طرف سے ان کی جو ذہن سازی کی جارہی ہے، کسی صاحب نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ یہی وہ بچے ہیں جنھیں آگے چل کر اس ملک کی باگ ڈور سنبھالنا ہے۔ وہ نسل، جو نہ تو ریاست کے بنیادی نظریے سے واقف ہو، نہ اس کی خاطر دی جانے والی قربانیوں کی قدر وقیمت کا کوئی احساس رکھتی ہو، اس سے کیا توقع رکھی جاسکتی ہے کہ وہ اس ملک کے قیام کے مقاصد کے حصول میں، اور حتی کہ جغرافیائی سرحدوں کے تحفظ اور پاسبانی میں کوئی کردار ادا کر سکے گی۔ اب تو اس بات کا بھی اہتمام کیا جارہا ہے کہ ہم اپنے بچوں کو تعلیم نہ دیں کہ پاکستان کی بنیاد "لا الہ الا اللہ" کے نعرے پر رکھی گئی تھی۔ اسلامیات اور مطالعہ پاکستان کے نصابات اسی وجہ سے اندرونی سیکولرز اور بیرونی دشمنوں کے پراپیگنڈے اور ریشہ دوانیوں کا ہدف بنے ہوئے ہیں۔ اس طرح قائدین تحریک پاکستان، خاص طور پر علامہ اقبال اور قائد اعظم رحمۃ اللہ علیہما کو سیکولر ثابت کرنے کے لیے ان کے اقوال وفرمودات کو توڑ موڑ کر، ان کی تعبیریں کی جارہی ہے گویا ان کے نزدیک پاکستان کے مطالبے کا مقصد اسلامی نظام حیات کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے مسلمانوں کو مواقع فراہم کرنا اور سہولت دینا نہیں تھا، بلکہ محض ایک "نیشن سٹیٹ" کا قیام اور اقتصادی مواقع کا حصول تھا، دو قومی نظریے کی کہانی بعد میں گھڑی گئی ہے۔

---

(1) https://www.dawn.com/news.1334995#comments

مطالبۂ پاکستان کا جواز اور قائد و اقبال کے افکار

حقیقت یہ ہے کہ مطالبۂ پاکستان کا کوئی جواز اور مسلمانوں کے علیحدہ قوم تسلیم کیے جانے کے اصرار کی اسلام کے سوا کوئی اور دلیل تھی ہی نہیں۔ ہندو اس بات پر مُصر تھے کہ مسلمان ہندوستانی قوم کا ایک حصہ ہیں رنگ، نسل اور جغرافیے، ہر اعتبار سے – در پردہ مقصود و مطلوب یہ تھا کہ مسلمان اقلیت بن کر رہنا قبول کر لیں۔ جبکہ برصغیر میں مسلمانوں کی پوری تاریخ اس پر گواہ تھی کہ یہاں ہندوؤں کے ساتھ مل جل کر رہنے کے باوجود، مسلمان اپنی الگ دینی شناخت اور تہذیب پر ہمیشہ قائم رہے۔ ہندو مذہب جو "اکال الامم" کہلاتا ہے۔[1] نہ صرف مسلمانوں کو اپنے اندر جذب نہ کر سکا، بلکہ اس کی اپنی آبادیوں کے ہر طبقے سے لوگ اسلام کے دامن رحمت میں پناہ لیتے رہے۔ اس کے لیے ماضی میں بھگتی اور سنگھٹن کی تحریکیں چلتی رہیں اور آج کے ہندوستان میں بھی "گھر واپسی" کے نام سے مسلمانوں کو ہندو دھرم میں لوٹ جانے کے لیے ترغیب و ترہیب جاری ہے۔

اسی طرح قائد اعظم اور علامہ اقبال کو لبرل اور سیکولر ثابت کرنا بھی آج کے پاکستان کا "فیشن" بن چکا ہے۔ خوش قسمتی یہ ہے کہ ان دونوں قائدین تحریک پاکستان کی ہر تقریر، تحریر اور بیان محفوظ ہے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ وہ شخصیت ہیں جنھوں نے، تحریک پاکستان کے نامور محقق خواجہ رضی حیدر کے بقول، کسی سیاسی پلیٹ فارم پر پہلی مرتبہ ایک علیحدہ ملک کی تجویز پیش کی تھی[2] واضح رہے کہ ۱۹۳۰ میں خطبہ الہ آباد آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں پیش کیا گیا تھا۔ پاکستانی سیکولر خواتین و حضرات علامہ اقبال کو سیکولر ثابت کرنے کے لیے ان کے ان اشعار اور نثری تحریروں کو پیش کرتے ہیں جس میں انھوں نے "ملّا" اور "ملّائیت" پر تنقید کی ہے۔ سیاق کلام کو سامنے رکھا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ اقبال کی یہ تنقید مذہبی جمود کے خلاف ہے، مذہب اور اسلام کے خلاف نہیں۔ اسلام ان کے خیال میں زندگی کے نہ صرف فکری اور اخلاقی، بلکہ ہر طرح کے عملی مسائل کا یقینی حل پیش کرتا ہے۔ خطبہ الہ آباد میں اقبال نے واضح کیا کہ یہ ان کی سوچی سمجھی رائے ہے جو برسوں کے غور و فکر کے بعد اُنہوں نے قائم کی ہے۔ خطبے کے آغاز ہی میں فرماتے ہیں:

> "I have given the best part of my life to a careful study of Islam, its law and polity, its history and its literature. This constant contact with the spirit of Islam as it unfolds itself in

---

(۱) شاہنواز فاروقی، "برصغیر کی ملت اسلامیہ کی تاریخ کا سنگ میل" ہفت روزہ فرائیڈے سپیشل، کراچی، ۲۲تا۲۸مارچ۲۰۱۹، جلد:۲۹، شمارہ:۱۲، ص:۲۴

(۲) انٹرویو خواجہ رضی حیدر، ہفت روزہ فرائیڈے سپیشل کراچی، ۲۲تا۲۸فروری۲۰۱۹، جلد:۲۹، شمارہ:۸، ص:۲۹

time, has, I think given me a kind of insight into its significance as a world fact."(1)

صرف خطبہ الہ آباد کو ہی اول سے آخر تک پڑھ جایئے، اقبال کہیں سے بھی سیکولر معلوم نہیں ہوتے، بلکہ "کٹر مسلمان" نظر آتے ہیں۔ پورے خطبے کی روح یہی ہے کہ اس خطے کے مسلمان، اسلام کی وجہ سے ایک امت اور قوم ہیں۔ ان کے سیاسی، تہذیبی اور اخلاقی و معاشی مسائل کا حل ایک الگ قومی ریاست میں ہے جس کی بنیاد نظریاتی ہو گی، رنگ نسل اور جغرافیہ نہیں۔ اقبال نے یہ پیغام صرف مسلم لیگ کے اجلاس میں زعماء کو ہی نہیں دیا بلکہ اپنی شاعری میں عام آدمی کو بھی دیا۔ مثلاً فرماتے ہیں:

اپنی ملت پر قیاس قوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
اُن کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تیری (۲)

ملت اسلامیہ کی نظریاتی بنیاد کے حوالے سے اقبال اتنے حساس تھے کہ مولانا حسین احمد مدنی کے دینی منصب و مقام کے باوجود، ان پر شدید ترین تنقید کی کہ وہ وطن کو قومیت کی اساس تسلیم کر رہے ہیں۔

عجم ہنوز نہ داند رموز دیں ورنہ
زدیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر از مقام محمد عربی است (۳)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے الہ آباد کے خطبے میں سیکولرازم کے بنیادی تصور، یعنی دین و سیاست کی لاتعلقی پر شدید تنقید بھی ملتی ہے۔ اقبال رحمۃ اللہ علیہ واضح کرتے ہیں:

"In Islam, God and the universe, spirit and matter, church and state are organic to each other…to Islam, matter is spirit, realizing itself in space and time"(4)

---

(1) Latif Ahmad Sherwani,speeches, writings and statement of Iqbal, academy, Pakistan 2015, p 3

(۲) علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال، الفیصل پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۵، ص: ۱۹۴

(۳) علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال، ص: ۱۹۴

(4) Speeches writings and statement of Iqbal, 5

انھوں نے اسلام پر اپنے ایمان کامل کا اظہار کرتے ہوئے یہ وضاحت ضروری بھی سمجھی کہ اسلام کا مطلب دینی وروحانی معاملات بھی ہیں اور دنیاوی بھی انفرادی بھی اور اجتماعی بھی۔۔۔ گویا وہ اسلام اور لادینیت میں فرق بالکل واضح کرتے جارہے تھے:

> "o address this session of the All- India Muslim League, you have selected a man who is not despaired of Islam as a living force for freeing the outlook of man from its geographical limitations, who believes that religion is a power of the utmost importance in the life of individuals as well as states and finally who believes that Islam is itself Destiny and will not suffer a destiny"(1)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے آگے چل کر بہت سے سوالات بھی اٹھائے تھے۔ بڑے کھرے، سیدھے اور براہ راست، مثلاً انھوں نے پوچھا کہ کیا مذہب ذاتی معاملہ ہے یا محض اخلاقی؟ اور کیا آپ اس کو بطور اخلاقیات قبول کرتے اور بحیثیت ریاستی پالیسی ردّ کرسکتے ہیں۔ ان قومی ریاستوں کی طرح، جہاں مذہب کو ریاستی معاملات میں دخل دینے کی اجازت نہیں ہوتی؟ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی واضح کیا کہ اسلام کا مذہبی اور معاشرتی نظام لازم وملزوم ہیں، ایک کے ترک کرنے سے دوسرا بھی جائے گا۔ اسی چیز کو بنیاد بناتے ہوئے علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے مطالبۂ پاکستان پیش کیا تھا کہ اسلام کے تمدنی حیثیت میں باقی رہنے کے لیے بھی اسے ایک سرزمین اور ایک علاقہ درکار ہے۔

> "The life of Islam as a cultural force in the country largely depends on its centralization in a specified territory"(2)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ اسلام کو انسانوں کے اقتصادی مسائل کا حل بھی سمجھتے تھے، اس بات کا ذکر انھوں نے خطبہ الہ آباد میں بھی کیا، اور قائد اعظم کے نام ایک خط میں بھی لکھا کہ اس کے لیے ایک ایسی خود مختار ریاست ضروری ہے جس میں اسلام کا قانون، یعنی شریعت نافذ ہو۔(۳)

ہر معاملے میں اسلام کے لیے رطب اللسان یہ علامہ اقبالؒ ہیں، جن کے بارے میں نئی نسلوں کو سمجھایا جا رہا ہے کہ سیکولر ہیں۔

اسی طرح قائد اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے افکار و نظریات اور بیانات کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ صرف ۱۹۴۰ سے ۱۹۴۷ کے دوران، انھوں نے اپنی نوے سے زائد تقاریر میں مسلم عوام کو پاکستان کے "اسلامی ملک" ہونے کی

---

(1) Ibid, 6

(2) Speeches, writings and statements of Iqbal, p.13

(۳) علامہ اقبال کا ایک خط بنام قائد اعظم، ۲۸ مئی، ۱۹۳۷

G. Allana, Pakistan Movement, Historical Documents, University of Karachi, 1969, p:129 - 133

یقین دہانی کروائی۔[۱] مسلم لیگ کے قائد اعظم کی قیادت میں ہونے والے ۱۹۴۳ کے اجلاس میں انھوں نے باقاعدہ ایک پلاننگ کمیٹی تشکیل دی جس کا مقصد یہ تھا کہ مجوزہ پاکستان کے لیے خالص اسلامی نقطہ نظر سے معاشرتی، تعلیمی، معاشی اور سیاسی نظامِ عمل مرتب کرے۔[۲]

۱۹۴۴ میں قائد اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے تحریک پاکستان میں سرگرم مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ پاکستان ایسی مسلم ریاست ہو گی، جو مسلمانوں کی عظمت رفتہ کو واپس لائے گی۔[۳]

جنوری ۱۹۴۸ میں کراچی بار ایسوسی ایشن میں وکلا سے خطاب کے دوران قائد اعظم نے واضح کیا کہ یہ صرف پراپیگنڈا ہے کہ پاکستان کا دستور شریعت اسلامی کے مطابق نہیں ہو گا۔ قائد اعظم نے فرمایا کہ یہ دستور شریعت کے مطابق ہو گا اور ہم دنیا کو یہ دکھائیں گے۔

> "Quaid-i- Azam, speaking at a reception… by the Bar Association, Karachi said that he could not understand the section of the people who deliberately wanted to create mischief and made propaganda that the constitution of Pakistan would not be made on the basis of shariat. The Quaid said "Islamic principles today are as applicable to life as they were thirteen hundred years ago." He said that he would like to tell those who are misled… "Some are misled by propaganda…Islam and its idealism has taught democracy. Islam has taught equality, justice and fair play to everybody. What reason is there for anyone to fear democracy, equality and freedom on the highest standard of integrity and on the basis of fairplay and justice for everybody…. Let us make it (the future constitution of Pakistan) we shall make it and show it to the world"[4]

"جولائی ۱۹۴۸ میں سٹیٹ بینک آف پاکستان کے افتتاح کے موقع پر قائد اعظم نے فرمایا کہ میں شوق اور دلچسپی سے معلوم کرتا رہوں گا کہ بینک کی مجلسِ تحقیق کیونکر ایسے طریقے وضع اور اختیار کرتی ہے جو معاشرتی اور اقتصادی زندگی کے اسلامی تصورات کے مطابق ہوں کیونکہ

---

(۱) طارق جان، سیکولرازم مباحث اور مغالطے، منشورات، لاہور، ۲۰۱۲، ص:۳۲۶

(2) Speeches, statements and messages of the Quaid-i-Azam, edited by Khurshid Ahmad Khan Yousafi, BazmeIqbal, Lahore 1996, 3/1803

(۳) قائد اعظم، تقاریر اور بیانات، ترتیب: اقبال احمد صدیقی، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۹۸، ۳/ ۲۸۰، ۲۸۱

(4) Speeches and Writings of Mr. Jinnah , edited by Jameel-ud-Din Ahmad, Sang-e-Meel Publications Lahore, 1989, 2/125

مغرب کے معاشی نظام نے انسان کے لیے مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ انھوں نے تقاضا کیا کہ بینک کا شعبہ تحقیق" اسلامی تعلیمات پر مبنی مثالی معاشی نظام دنیا کے سامنے پیش کرے جو حقیقی اسلامی تصورات پر قائم ہو" (۱)

مندرجہ بالا سطور میں قائد اعظم اور علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہما کے افکار و بیانات کی روشنی میں واضح ہے کہ پاکستان میں سیکولرازم کے فروغ کے لیے کوشاں اور ہر ابلاغی محاذ پر سرگرمِ عمل افراد کس طرح قوم کو ہر روز دھوکہ دینے میں مصروف ہیں۔ تحریک پاکستان سے واقف افراد تو ان کے دامِ ہمرنگ زمین کا شکار نہیں ہوتے، لیکن نئی نسلیں، جن کے نصاب ان کی خاطر خواہ رہنمائی کر رہے ہیں، نہ کسی اور ذریعے سے انھیں نظریہ پاکستان اور تحریک پاکستان سے واقف کروایا گیا ہے، ان کا آسان ہدف ہیں۔ یہ اس ملک کے ساتھ بھی زیادتی ہے اور نسل نو کے ساتھ بھی۔

اس وقت شاید اعداد و شمار کی صورت میں پاکستان میں سیکولر فکر کے متاثرین کی تعداد کو پیش کرنا ممکن نہ ہو، لیکن جو لوگ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں بیٹھے ہیں اور نوجوان طلبہ وطالبات سے براہ راست تعلق میں ہیں، بخوبی واقف ہیں کہ یہ مسموم افکار نوجوان نسل میں کس تیزی سے نفوذ حاصل کرتے جا رہے ہیں۔ اسلامی معاشرے کے مسلمہ امور اور اقدار وروایات پر سوالات اور بحث کے دروازے کھلتے جا رہے ہیں۔ عقائد اور تعلیمات دین کے حوالے سے تشکیک کا زہر سرایت کرتا جا رہا ہے۔ تشکیک (Skepticism) حقیقت میں سیکولرازم کا پہلا مورچہ ہے۔ اس کی تعریف ہی یہ ہے:

"The theory that certain knowledge is impossible"(2)

اس کے مقابلے میں مذہب کی بنیاد یقین پر ہے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول نقل کرتے ہیں:

"اليقين الايمان كله"(۳)

تشکیک، بے یقینی اور مذہبی اصولوں اور اقدار روایات سے بے اعتنائی کے نتیجے میں اخلاقی بگاڑ روز افزوں ہے۔ خواتین ڈاکٹروں (Gynacologist) سے ملیں یا ماہرین نفسیات سے، اعداد و شمار پریشان کن ہیں۔ لاہور کے ایک بڑے سرکاری ہسپتال میں اٹھائیس سال سے خدمات سرانجام دینے والی ایک خاتون ماہر نفسیات نے ایک سیمینار کے شرکاء کو بتایا کہ اس وقت، اس شہر میں جتنا بڑا اور جتنا مہنگا تعلیمی ادارہ ہے، اتنے ہی وہاں کے طلبہ وطالبات کے نفسیاتی واخلاقی مسائل، منشیات کے استعمال اور اقدام خودکشی کے معاملات سامنے آرہے ہیں۔ خواتین ڈاکٹر مخلوط

(1) Speeches, Statements and Messages of Quaid-i-Azam , 4/2787
(2) https://en.oxforddictionaries .com/definition/skepticism
(۳) بخاری، صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب قول النبی بنی الاسلام علی خمس، مکتبہ دارالسلام، ریاض، ۱۹۹۹، ص:۵

تعلیمی اداروں میں اخلاقی بگاڑ سے پیدا ہونے والے کم عمر لڑکیوں کے عجیب مسائل کا ذکر کرتی ہیں۔ یہ دین سے دوری کی بنا پر پیدا ہونے والے فساد کی صورت حال ہے، جبکہ فصل ابھی تیاری کے مرحلے میں ہے۔

قیاس کن از گلستان من بہار مرا

ظاہر ہے، ان حالات تک ہم ایک دن میں نہیں پہنچے۔ ہماری ستر سالہ تاریخ کی غلطیاں اور غفلت اس کا سبب ہیں۔ سبھی اسباب کا تذکرہ ممکن نہیں، لیکن تین اہم اسباب پر اس محدود مطالعے میں کچھ معروضات پیش کی جائیں گی۔

پاکستان میں سیکولرازم کا فروغ اور ملکی سیاست کا کردار

مملکت خداداد پاکستان کی یہ بہت بڑی خوش نصیبی تھی کہ قیام پاکستان کے مقاصد اول روز سے ہی، عوام وخواص، سب کے ذہنوں میں واضح اور متعین تھے۔ قیام پاکستان سے پہلے ۱۹۴۳ء کے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں ایک پلاننگ کمیٹی بنادی گئی تھی، جس کے ذمے تھا کہ وہ "پاکستان کے لیے خالص اسلامی نقطہ نظر سے معاشرتی، تعلیمی، معاشی اور سیاسی نظام مرتب کرے"۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد جب ملکی نظام گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں جزوی ترامیم کے ساتھ چلایا جارہا تھا، مارچ ۱۹۴۹ء میں کسی مکمل آئین کی تیاری سے پہلے، رہنما اصولوں پر مشتمل ایک قرار داد منظور ہوئی۔ اس قرار دادِ مقاصد کا منظور ہونا اس ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے حوالے سے ایک بہت بڑی پیش رفت تھی۔ اگرچہ آج یہ قرارداد مقاصد بھی سیکولر گروپوں کے نشانے پر ہے اور اس کے آئین میں موجود رکھنے اور نہ رکھنے کے حوالے سے بھی قوم کو تقسیم کرنے کی کوششیں جاری ہیں[1] ایسے میں ملکی سیاسی قیادتوں کے لیے یہ بڑا آسان معاملہ تھا کہ جب پالیسی اصولوں کی صورت میں بھی لائحہ عمل طے کر دیا گیا ہے اور عوام کی اکثریت بھی ملک میں اسلام کے نفاذ کی خواہاں ہے، تو اس کے لیے قانون سازی اور عمل درآمد کی کوششیں شروع کر دی جاتیں۔ یوں مملکت خداداد پاکستان بھی نبی کریم ﷺ کے اسوے، اقبال اور قائد کی خواہشات اور قوم کی امنگوں کے مطابق، پوری دنیا کے لیے مثالی اسلامی ریاست بنتی۔

نبی کریم ﷺ نے جب مدینہ میں اسلامی ریاست قائم فرمائی، تو اس نے پوری دنیا کے سامنے اسلامی نظام حیات کی برکتوں کو کھول کر رکھ دیا تھا۔ روم وایران کی متمدن قومیں مفتوح ہوئیں، ان کا قبول اسلام اگر جبری نہیں تھا، تو اس کے پیچھے اسلام کے عادلانہ نظام کی شہرت بھی تھی۔ مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "جب مدینے میں اسلام کا چھوٹا سا اسٹیٹ قائم ہوا جس میں اسلام کے انتظامی، تعلیمی، عدالتی، معاشی، معاشرتی، مالی، جنگی اور بین الاقوامی پالیسی کا ایک ایک پہلو واضح ہوا، ہر شعبہ زندگی کے

---

(۱) طارق جان، سیکولرازم مباحث اور مغالطے، ص:۳۸۱-۵۳۹۰

لیے اصول بنے، ان اصولوں کو عملی حالات پر منطبق کیا گیا، اس خاص طرز پر کام کرنے والے کارکن تعلیم، تربیت اور عملی تجربے سے تیار کیے گئے۔۔۔ ان لوگوں نے اسلام کی حکمرانی کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ آٹھ سال کی مختصر مدت میں مدینہ جیسے ایک چھوٹے سے قصبے کا اسٹیٹ، پورے عرب کی سلطنت میں تبدیل ہو گیا۔ جوں جوں لوگ اسلام کو اس کی عملی صورت میں، اور اس کے نتائج کو محسوس شکل میں دیکھتے تھے، خود بخود اس بات کے قائل ہوتے جاتے تھے کہ فی الواقع انسانیت اسی کا نام ہے اور انسانی فلاح اسی چیز میں ہے"۔ (۱)

پاکستان میں المیہ یہ ہوا کہ جو لوگ یہاں مسند اقتدار پر متمکن رہے، الا ماشاء اللہ، نفاذ اسلام کے لیے قانون سازی ان کی ترجیحات میں کبھی شامل نہیں رہی۔ حکمرانوں کی اکثریت بنیادی فرائض دین کی تعلیم تک سے نابلد اور ان کی ادائیگی سے گریزاں رہی اور بسا اوقات منکرات و فواحش اور کبائر میں خود بھی مبتلا اور ان کی سرپرست بنی رہی۔ حالانکہ اسلامی تعلیمات کے مطابق سیاسی مناصب حقیقت میں دینی مناصب ہیں اور اسلامی سیاست کا بنیادی نکتہ دنیاوی معاملات کے نظم و نسق کے ساتھ ساتھ، دین کی حفاظت اور قیام بھی تھا۔ اسلامی نظام سیاست پر شہرہ آفاق کتاب "الاحکام السلطانیہ" کے مصنف، امام ماوردی لکھتے ہیں:

"الامامة موضوعة لخلافة النبوة فی حراسة الدین وسیاسة الدنیا"(۲)

دین اور سیاست، دونوں میدانوں میں ہماری حکومتیں بری طرح ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ جو سیاسی نظام "گورے آقاؤں" نے یہاں چھوڑا تھا اپنی پوری روح کے ساتھ آج بھی جاری و ساری ہے۔ بالادست طبقات نہ صرف سیاست بلکہ پورے ملکی وسائل پر قابض ہیں اور عوام الناس ذلیل و محکوم۔ اس کے لیے ملکی معاملات کے چند اہم پہلوؤں کو دیکھنا بھی کافی ہو گا کہ ملکی انتظام چلانے والوں نے کسی ایک نظام کو بھی درست نہیں کیا۔

مثلاً معاشی نظام کو دیکھیں، تو قائد نے "مثالی معاشی نظام" کی تیاری کی خواہش اور تمنا ظاہر کی تھی۔ نہ وہ تیار ہو سکا، نہ نافذ ہو سکا۔ آج نتیجہ یہ ہے کہ ملک کی نصف سے کچھ ہی کم آبادی خطِ غربت سے نیچے زندگی گزار رہی ہے۔ بھوک کے عالمی جائزوں میں ہم دنیا میں گیارھویں نمبر پر ہیں۔ (۳) کم خوراکی کی وجہ سے زچگی میں ماؤں اور پانچ سال سے کم عمر بچوں میں قابل علاج امراض سے مرنے والے بچوں کی اموات کے اعداد و شمار تشویش ناک ہیں۔ (۴) فی صد

---

(۱) مودودی، سید ابوالاعلی، سیرت سرور عالم، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور ۲۰۱۳، ۳/۳۷۸

(۲) ماوردی، محمد بن حبیب، الاحکام السلطانیہ، دارالکتاب العربی، بیروت، ۱۹۹۹، ص: ۲۹

(3) world peace foundation Bonn/Washington DC/Dublin, 2015, p.18

(4) UNICEF, Pakistan Annual Report 2013, UNICEF, Pakistan 2013 p.17

سے زائد آبادی کو پینے کا صاف پانی میسر نہیں۔ (۱) فی صد آبادی کی خوراک ناکافی ہے اور وجہ خوراک کی عدم دستیابی نہیں بلکہ وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم ہے۔ (۲) سود کی لعنت معیشت کی تباہی کی بڑی وجہ ہے اور اس سودی نظام کو پورا ریاستی تحفظ حاصل ہے۔ حکومتی سطح پر ہی نہیں، گلی محلوں کی سطح پر یہ کاروبار روز افزوں ہے۔ ادارہ "اخوت" کی چھاپی گئی کتاب میں لکھی گھریلو سود کے ہاتھوں عام آدمی کی تباہی کی ہوش ربا تفصیلات ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔ (۳)

سرکاری بینک الگ سے عام لوگوں کو سودی قرضے جاری کرتے ہیں۔ ہوم فنانسنگ، کار فنانسنگ، تعلیم فنانسنگ وغیرہ، ایسے میں یہ المیہ نہیں کہ سودی نظام کے خاتمے کے کسی متوقع فیصلے کے خلاف حکومت پاکستان نے اپیل دائر کر دی کہ ہم اس کے بغیر معیشت نہیں چلا سکیں گے۔ (۴) اور یہ معاملہ برسوں سے زیر التوا ہے۔

معاشرتی نظام کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنا بھی قیام پاکستان کے مقاصد میں شامل تھا۔ جس کے لیے اسلام کے فوجداری قوانین کے نفاذ کی ضرورت تھی۔ حقائق اس معاملے کے بھی چشم کشا ہیں۔ قیام پاکستان کے بتیس سال بعد تک بدکرداری کوئی قانونی جرم نہیں تھا۔ (۵) ۱۹۷۹ میں حدود آرڈی ننس نافذ کیا گیا اور ہر پاکستانی کو معلوم ہے کہ سیکولر طبقے نے اس کے خلاف کیسی مہم چلائی۔ صرف صحافی نہیں، پورے میڈیا گروپ اسلام کے خلاف پراپیگنڈا کے لیے استعمال ہوئے۔ مغرب کو تو اسلام کے نفاذ سے مسئلہ تھا ہی، چنانچہ اہلِ علم گواہ ہیں کہ مغربی دنیا اور امریکہ کے سفارت خانوں کو مہم سونپی گئی کہ وہ ان قوانین کو منسوخ کروائیں۔ (۶)

آج ناموسِ رسالت اور قادیانیت کے بارے میں آئین اور قانون کو اسی طرح ہدف بنالیا گیا ہے۔ قادیانیت برصغیر میں کوئی نیا معاملہ نہیں ہے اور اس معاملے پر علماء میں کوئی اختلاف بھی موجود نہیں ہے۔ پاکستان کی پارلیمنٹ میں منظور کردہ "آئینی شق" جس میں قادیانیوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا گیا، کے خلاف پاکستانی سیکولرز کی بیرونی سرپرستی میں چلائی جانے والی اس مہم میں حکام بالا، حتی کہ پارلیمنٹ کے اراکین تک ملوث ہیں۔ یہ آئینِ پاکستان کے ساتھ خیانت ہے۔ سیاسی پارٹیاں بیان کچھ اور دیتی ہیں، درون خانہ پالیسی اور طرز عمل کچھ اور ہے۔ اسی

---

(1) Pcrwr.gov.pk/water% 20 quality. Aspx; retrieved on 2-1-2017 PCRWR, Water quality: 1

(2) Statement Bank Annual report , 2011 – 2012 , p.27,28

(۳) پاکستان میں سودی قرضوں کے جال میں پھنسے غریب لوگوں کو سود کے چنگل سے نکالنے کے لیے مخیر حضرات نے ایک ادارہ "اخوت" کے نام سے قائم کیا ہے۔ اس ادارے نے "اخوت کا سفر" کے نام سے اپنی کارکردگی کے حوالے سے چند لوگوں کی روداد پر مشتمل کتاب شائع کی ہے جن کی اس ادارے کی وجہ سے سودی قرضوں سے گلو خلاصی ہو سکی۔ (ڈاکٹر محمد امجد ثاقب، اخوت کا سفر، ماورا بکس، لاہور، ۲۰۱۳)

(۴) انصار عباسی، "کس سے منصفی چاہیں"، روزنامہ جنگ، ۳۱ جولائی ۲۰۱۷، ص:۳

(۵) غازی، ڈاکٹر محمود احمد، خطبات کراچی، زوار اکیڈمی پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۲ء، ص:۲۳

(۶) ایضاً، ص:۲۲۰

طرح قانون ناموس رسالت کے حوالے سے اقلیتوں کے حقوق کا واویلا مسلمان کریں یا خود اقلیتی گروہ، کہ یہ قوانین ان کے خلاف استعمال کیے جاتے ہیں، اس معاملے میں ناقابل فہم ہے۔ کیا اقلیتیں اس جرم کی خواہاں ہیں اور اس کے مرتکبین کے لیے رعایت کی طالب؟ اہم سوال یہ بھی ہے کہ دنیا بھر میں "جمہوریت" کے بنیادی تصور کے مطابق، قوانین اقلیت کی رائے کے مطابق بنائے جاتے ہیں یا اکثریت کی رائے پر؟ اور سب سے بڑھ کر سوال یہ بھی ہے کہ نصوص شریعت سے انحراف کی راہ اختیار کرنے کی کوئی "اسلامی جمہوریہ" مجاز بھی ہے یا نہیں؟

خواتین کے حقوق کے حوالے سے قانون سازی بھی سرکاری سطح پر اسلام کے ساتھ مذاق کی ایک مثال ہے۔ ۱۹۶۱ء کے عائلی قوانین، بعض شقوں پر علماء کرام کے تحفظات کے علی الرغم نافذ کیے گئے۔ آج بھی ان قوانین کی ایک شق بہت بڑے معاشرتی مسائل کا باعث بنتی ہے۔ یعنی دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی کی اجازت کی شرط، جس کا سرٹیفیکٹ ثالثی کونسل دے گی۔ عملاً خواتین "یہ اجازت" (جو شرعاً کوئی شرط نہیں ہے) نہ دیں تو طلاق کا سامنا کرتی ہیں یا گھریلو تشدد کا، اور بعض انتہائی صورتوں میں "اجازت نہ دینے پر شوہر نے قتل کر دیا" کی خبر اخبارات میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ ایسے ہی بعض مسائل مختلف ادوار میں آنے والے تحفظ نسواں بل میں تھے۔ مثلاً ۲۰۱۶ کے گھریلو تشدد کے خلاف بل میں مردوں کو کڑا پہنانا، جیل بھیجنا وغیرہ، جس کی وجہ سے مسائل اور بھی بڑھنے کا امکان ہے، جیسا کہ گھر ٹوٹنا یا تشدد میں اضافہ۔ واضح رہے کہ اسلام ان جھگڑوں کو خانگی طور پر حل کرنے پر زور دیتا ہے۔ مملکت خداداد پاکستان کے کارپردازوں کو آج بھی یقین نہیں ہے کہ شریعت، آسمانی حکمت اور عدل کا کامل نمونہ ہے۔ شرعی قوانین سے آگے بڑھ کر، اقوام متحدہ اور بیجنگ کانفرنسوں کے ایجنڈے کے مطابق خواتین کے حق میں قانون سازی کی کوششیں الٹا خواتین کے مسائل میں اضافہ کرتی ہیں۔ علماء کرام کے ان قانون سازیوں پر اعتراض کو "اسلام کے خواتین سے امتیازی سلوک" اور "ملائیت" کے کھاتے میں ڈال کر سیکولر فکر کے حلقۂ خواتین میں نفوذ کے لیے سازگار ماحول مہیا کیا جاتا ہے۔ خواتین کی این جی اوز ایسے ہی معاملات پر احتجاج کے ذریعے ملکی قانون اور سیاست میں اثر انداز ہونے کے قابل ہوئی ہیں۔ مثلاً بائیں بازو کی ایک مشہور وکیل خاتون نے کہا کہ:

> "ہم حدود قوانین کو سرے سے ختم کروانے میں کامیاب نہیں ہو سکے لیکن وہ قوانین جو تسلیم شدہ تھے، ہماری کوششوں کے نتیجے میں متنازعہ ضرور بن گئے ہیں"(۱)

اس سال ۲۰۱۸ء میں خواتین کے عالمی دن کے موقع پر عجیب و غریب نعروں والے بینرز اور پلے کارڈ اٹھائے خواتین کے جلوس پاکستانی معاشرے کے سنجیدہ طبقے کے لیے رنج کا باعث بنے۔

---

(۱) ش فرخ، فصیلوں کے ادھر، مشعل پبلی کیشنز، لاہور، س ن، ص:۱۰۶

۱۹۷۳ء کے دستور کے ایک اور رہنما اصول کہ "حکومت اسلامی روایات کے فروغ کے لیے بھی کوشش کرے گی" کی پامالی بھی جابہ جا دیکھنے کو مل رہی ہے۔ آج تک بھی ذرائع ابلاغ کے لیے کوئی رہنما اصول متعین نہیں ہو سکے کہ ان کی حدود کار کیا ہیں۔ مثلاً فحاشی کی تعریف[1] اسی طرح پرائیویٹ چینلز کسی بھی ضابطے سے باہر ہیں۔ بے مہار میڈیا بھی سیکولرازم کی ترویج کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ مغربی اور ہندو تہذیب اس میڈیا کے ذریعے ہی پاکستانی معاشرے میں نفوذ پذیر ہوئی ہے۔ ان چینلز پر مباحثے اور مذاکرے جاری رہتے ہیں جن کے موضوعات میں پاکستان کی اسلامی شناخت، قرارداد مقاصد، احکام دین، آئین کی اسلامی دفعات سبھی شامل ہیں اور ظاہر ہے سیکولر "مفکرین" ان Talk Shows کے مہمان خصوصی ہوتے ہیں۔ دنیا کی کسی جمہوریہ میں ملک کے بنیادی نظریے یعنی Matanarrative کے ساتھ اس کھلواڑ کی مثال نہیں ملتی۔

سیکولر افکار کا نفوذ بذریعہ تعلیم

دنیا بھر میں تعلیمی پالیسیاں حکومتی اور قومی سطح پر تشکیل دی جاتی ہیں۔ قومی نظریہ کوئی بھی ہو، اس کی ترویج اور تہذیب و تمدن کی حفاظت اور ترقی تعلیم کے ایک مربوط نظام ہی کے ذریعے ممکن ہے۔

قیام پاکستان سے پہلے بھی مسلمان کئی قسم کے تعلیمی تجربات کر رہے تھے مثلاً دیوبند، علی گڑھ، ندوہ اور جامعہ ملّیہ وغیرہ۔ تعلیم کی اہمیت کے احساس کے پیش نظر ۱۹۴۳ء میں مسلم لیگ کے اجلاس میں جو کمیٹی تشکیل دی گئی اس کا ایک فریضہ یہ بھی تھا کہ وہ مجوزہ مملکت کے لیے تعلیمی نظام کا خاکہ مرتب کرے۔ ۱۹۷۳ء کا دستور جو آج بھی نافذ ہے، اس کے رہنما اصولوں میں دو نکتے بڑی صراحت کے ساتھ تعلیمی نظام کا رخ متعین کرتے ہیں، لیکن افسوس ہے، اس حوالے سے ہم کامیاب نہیں ہو سکے۔ پالیسی اصولوں میں لکھا گیا کہ:

> "مسلمانان پاکستان کی زندگیوں کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لیے اقدامات کیے جائیں گے اور مواقع بہم پہنچائے جائیں گے کہ وہ قرآن و سنت کی روشنی میں زندگی کا مفہوم سمجھ سکیں۔۔۔اور (دوسرا نکتہ) حکومت یہ کوشش کرے گی کہ قرآن پاک اور اسلامیات کی تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے"[2]

ان اصولوں کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے، تو اگرچہ اسلامیات کو شامل نصاب کیا گیا لیکن بارہ سالہ ہائر سیکنڈری ایجوکیشن کے دوران پورے سلیبس کی مختصر ترین کتاب یہی ہے۔ اس کے بعد **BS** کا مرحلہ ہے جہاں ہائر ایجوکیشن کمیشن نے کم از کم ایک سو چوبیس اور زیادہ سے زیادہ ایک سو چالیس کریڈٹ آور کی تعلیم ضروری قرار دی ہے۔[3]

---

(1) Defining obscenity in Pakistan, Editorial: The Express Tribune , defining – obscenity. in. Pakistan, 28-08-2012 https://tribune.com.pk/story/426113

(۲) ڈاکٹر صفدر محمود، آئین پاکستان وضاحت، موازنہ اور تجزیہ، جنگ پبلشر، لاہور، ۱۹۹۶، ص:۵۶

(3) Hec.gov.pk>universities>Documents

اس چار سالہ تعلیم کے دورانیے میں اسلامیات کی تعلیم کے لیے صرف دو کریڈٹ آور مختص ہیں۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے اواخر میں قرآن مجید کو نصاب کا حصہ بنانے کی کوششوں کا آغاز ہوا تھا، لیکن طاقتور اور مؤثر لابیز نے اس کو چلنے نہیں دیا۔ ترجمۂ قرآن مجید کا نصاب سکڑتے سکڑتے کم ترین سطح پر آچکا ہے۔ قرآن مجید کے ترجمے کو سمجھنے کے لیے عربی لازمی کی گئی، اس کے لیے نصابات تیار ہوئے لیکن اس کے خلاف پنجاب حکومت نے اپیل کی اور اس کی لازمی حیثیت کو عدالتی فیصلے کے ذریعے ختم کروا دیا۔[1] دوسری طرف نئی نسلوں کو "قرآن وسنت کی روشنی میں زندگی کا مفہوم سمجھانے کے لیے جس نظام تعلیم کی ضرورت تھی، وہ کبھی نافذ نہیں ہو سکا۔ آج اس حوالے سے ہم انتہائی نازک اور خطرناک صورت حال سے دوچار ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق اس وقت پاکستان کے چار میں سے تین بچے پرائیویٹ سکولوں میں جارہے ہیں۔[۲] مشنری سکول، گرامر سکول، غیر ملکی نصاب کے تحت بیرون ملک امتحان دلوانے والے مہنگے پرائیویٹ سکول، سب کا جال پھیلا ہوا ہے۔ کچھ ادارے وہ بھی ہیں جو غیر ملکی امداد اور بعض تو دشمن ممالک کی بھاری سرمایہ کاری کے ساتھ چل رہے ہیں۔ سکولوں سے آگے بڑھ کر کالج اور یونیورسٹیاں بھی پرائیویٹ سیکٹر میں بن چکی ہیں روزگار کے میدان میں اور خاص طور پر کلیدی مناصب پر لاکھوں روپے فیس وصول کرنے والی ان مہنگی یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل طلبہ کی کھپت ہے۔ سنجیدہ اور محب وطن اہل فکر برسوں سے اس بات کی نشاندہی کر رہے ہیں کہ ملک کا عام طالب علم سخت محنت کے باوجود پیچھے دھکیلا جارہا ہے۔ وہ طبقہ، جو ملکی سیاست، معیشت اور انتظامیہ کی باگ ڈور سنبھالتا ہے، انھیں اداروں کی پیداوار ہے اور یہ ادارے اپنے نصاب اور نظام، دونوں کے حوالوں سے سیکولرازم کی نرسریاں بن چکے ہیں۔

ان اداروں کے نصاب کو دیکھا جائے تو وہ پورے کا پورا درآمد شدہ ہے۔ حتی کہ اسلامیات کی کتب بھی باہر سے تیار شدہ آتی ہیں۔ اس نصاب میں مطالعۂ پاکستان شامل ہی نہیں، بلکہ اس کی جگہ Social Studies کا کورس پڑھایا جاتا ہے، اور وہ بھی غیر ملکی مصنفین کا تحریر کردہ۔ کبھی ان کتابوں میں پاکستان کا غلط نقشہ چھاپ کر کشمیر کو ہندوستان کا حصہ دکھایا جاتا ہے اور کبھی مسلمانوں اور پاکستان کی تاریخ کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ پوری معاشرت اور تہذیب، جو ان کتابوں میں پیش کی جاتی ہے، مغربی ہے۔ لباس، کردار، رہن سہن، مشاغل، طرز زندگی، ناچ گانا، حتی کہ گلیوں اور شہروں کے نام بھی۔۔۔ یہی کچھ پڑھتے ہوئے بچے جب بڑے ہوتے ہیں اور ان سکولوں کالجوں سے نکلتے ہیں تو پاکستانی معاشرہ اور دینی معاشرت، دونوں ان کے لیے اجنبی ہوتے ہیں۔ اس پر مستزاد ان اداروں کا ماحول ہے۔ اساتذہ کو دیکھا جائے یا طلبہ وطالبات کو لباس، طرز زندگی اور تقریبات سب مغربی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ کلاس روم کا ماحول ہو یا سوال اٹھانے اور اقدار کو چیلنج کرنے کی دعوت اور اس میں

(1) Daily Dawn, Sep , 19, 2018 (www.dawn.com)news 1433890

(۲) روزنامہ جنگ، لاہور، ۳۰ مئی ۲۰۱۷، ص:۳

مہارت۔۔۔۔۔ دین و مذہب اور اسلامی اقدار و روایات عمومی طور پر اس نظام سے باہر کر دیے گئے ہیں۔ بے باکی (Boldness) اعلیٰ ترین قدر ہے اور اس کا شرمناک مظاہرہ ایسی ایک یونیورسٹی کی طالبات نے خواتین کے استعمال کی چیزوں کی دیواروں پر نمائش کے ذریعے کیا جسے بیرونی ذرائع ابلاغ نے بھی رپورٹ کیا۔[1] ان سکولوں کے بچے بڑے وافر فارن سکالرشپس حاصل کرتے ہیں۔ A level اور حتی کہ O level کے بعد بھی بیرون ملک کے لیے تعلیمی وظائف میسر ہیں۔ کراچی کی ایک نویں جماعت کی طالبہ، جو امریکہ میں سکول فائرنگ کا شکار ہوئی ایسے ہی ایک exchange program کے تحت وہاں پہنچی تھی۔ ان سکولوں کا کوئی بچہ A level کے بعد پاکستان میں تعلیم کے لیے تیار نہیں اگر اسے موقع مل جائے بیرون ملک جانے کا۔

ان حالات میں مملکت کا اسلامی نصب العین، حب الوطنی، نظریہ پاکستان، مثالی اسلامی ریاست، اسلامی معیشت کا مثالی نظام۔۔۔ یہ سب باتیں خواب ہیں اور از کار رفتہ۔۔۔ عقیدہ اور عبادات بے کار مشق ہیں اور زندگی کے مسائل کا حقیقی حل سیکولرازم۔۔۔ سوشل میڈیا پر گروپ بن رہے ہیں۔ ماہانہ، دوماہی اجلاس جاری ہیں، سکولوں کالجوں، حتی کہ گلیوں محلّوں میں دعوت دی جارہی ہے کہ سیکولرازم کی آواز کو اب دبانا ممکن نہیں ہو گا۔ لاہور کی ایک متوسط طبقے کی بستی میں بچوں نے پنسل سے کارٹون بنا کر گھروں میں پھینکے جن کا پیغام یہ تھا کہ اس ملک میں صرف اسلام کی تعریف کر کے زندہ رہا جاسکتا ہے، سیکولرازم اور Atheism کی بات کرنے والے کی چونچ کاٹ دی جاتی ہے، یعنی اسے بولنے کا حق نہیں دیا جاتا۔ چرچ، اس قبیل کے تعلیمی اداروں کے ساتھ مل کر مسلمان بچوں کے لیے Tolerance پر سیمنیار منعقد کروا رہے ہیں۔ اساتذہ، حتی کہ بعض سرکاری یونیورسٹیوں کے بھی، اپنے لیکچرز میں سیکولر افکار بچوں کے ذہنوں میں انڈیل رہے ہیں، اور اس حوالے سے ملک کی اعلیٰ ترین سطحوں پر کوئی اضطراب ہے نہ پریشانی۔ تہذیبی راستے سے سیکولرازم کی طرف لے جانے والی ایسی صرف ایک سکول چین (School Chain) کے طلبہ و طالبات کی تعداد ان کی اپنی ویب سائیٹ کے مطابق ڈھائی سے پونے تین لاکھ ہے۔ گزشتہ سال سوشل میڈیا پر Bloggers کا جو فتنہ اٹھا، عالمی سطح پر ان کی تائید و حمایت ہوئی اور ان کی رہائی کے مطالبے، اور پھر حکومت کو انھیں رہا کرنا پڑا، ان میں سے بعض انھیں سکولوں کے "فارغ التحصیل" تھے۔ یہ قومی سطح پر تعلیم کے ذریعے سیکولرائزیشن کی پوری مہم ہے۔ اس کا ادراک اور تدارک نہ کیا گیا تو آنے والے آٹھ دس سالوں میں نمودار ہونے والے نتائج تباہ کن نظر آرہے ہیں۔

سیکولرازم کے سدِّباب میں علماء کرام کا کردار

(1) Breaking taboos: students of BNU Lahore cover a university wall with sanitary pads. http://www.indiatoday.in>story

پاکستان میں دینی روایات کے تحفظ، مساجد کی آبادکاری اور عبادت کی حد تک تعلیم و تذکیر کا اہتمام کرنے میں دینی مدارس اور علماء کی خدمات بہت نمایاں ہیں۔ یہ اعتراف بھی بے جانہ ہو گا کہ دعوت و تبلیغ کی سرگرمیوں میں دینی جماعتوں کا اہم کردار ہے، جن میں سے بعض اب خدمت خلق کے معاملات میں بھی ملکی سطح پر بھی سامنے آئی ہیں۔ ان دینی جماعتوں کو کارکن مساجد اور مدارس سے حاصل ہوتے ہیں۔ ان خدمات کے اعتراف کے باوجود دین سے دلچسپی اور تعلق رکھنے والے ہر پاکستانی کے لیے یہ حقیقت بڑی تلخ اور المناک ہے کہ پاکستان میں سیکولرازم کے فروغ میں بڑا کردار، اہل دین و مذہب کا بھی ہے براہ راست نہ سہی بالواسطہ ہی سہی۔

اگرچہ امت کے ہر فرد کے لیے دینی فرائض کے علم کا حصول لازم ہے، اور جتنا سیکھا ہو، اسے دوسروں تک پہنچانا بھی اس کی ذمہ داری ہی ہے۔

"فلیبلّغ الشاھدُ الغائبَ"(۱)

اس کے باوجود اس حوالے سے اہلِ علم کی ذمہ داریاں ایک عام آدمی سے زیادہ ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے علماء کرام کو انبیاء کرام علیہم السلام کا وارث قرار دیا ہے۔

"العلماء ورثۃُ الانبیاء"(۲)

اگر یہ وارثین علوم نبوت اپنی ذمہ داریاں کما حقہ ادا کرتے تو شاید صورت حال یہاں تک نہ پہنچتی۔ ان کوتاہیوں کے چند نمایاں پہلو جو سیکولر افکار کے فروغ کا سبب بنے، توجہ کے طالب ہیں۔

اولاً قیام پاکستان کے وقت ہی واضح تھا کہ دنیا بھر میں فروغ پاتے نت نئے فلسفوں اور افکار سے امت مسلمہ نئی نسلوں کو بچانا آسان نہیں ہے۔ اُس وقت پوری دنیا میں سرمایہ داری، اشتراکیت، قومیت اور جمہوریت کی تحریکیں چل رہی تھیں۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ دین و شریعت کی تعلیمات کو ان کی حکمتوں کے ساتھ، نئے محاورے، نئے اسلوب اور نئی قابلِ فہم اصطلاحات کے ساتھ مربوط طور پر پیش کیا جاتا۔ نئے افکار کی حقیقت دین کی روشنی میں سمجھنے، اور اس سے بڑھ کر سمجھانے کی کوشش کی جاتی کیونکہ نسلِ نو ان "جدید" افکار و نظریات کی طرف لپک رہی تھی۔ کمیونزم اس کی مثال ہے کہ مسلم عرب ممالک کے علاوہ خود پاکستان میں ایک وقت میں اس کے اثرات کتنے زیادہ اور کس قدر خطرناک تھے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ ہمارے طبقۂ علماء کی طرف سے ایسے فتنوں کے سدِباب کی کوششیں بہت کم ہوئیں۔ قدیم و جدید سے واقف بعض صحیح الفکر اہل علم نے اس خلا کو پر کرنے کی کوششیں کیں تو مذہبی حلقے ان کے خلاف یک زبان ہو گئے۔ تکفیر، تضحیک، بے بنیاد الزامات، حتی کہ دشنام تک کا ہدف بنایا۔ خود اس

(۱) بخاری، صحیح بخاری، کتاب الحج، باب الخطبہ ایام منیٰ، حدیث نمبر: ۱۷۳۹

(۲) بخاری، صحیح بخاری، کتاب العلم، باب العلم قبل القول والعمل، حدیث نمبر: ۷۶

پائے کی مثبت کوشش نہیں کر سکے، اور نہ دوسری کوششوں کو بلا رکاوٹ نتیجہ خیز ہونے دیا۔ اہل علم کے اس منفی کردار نے نوجوانوں کو دین سے برگشتہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

دوسرا اہم پہلو مسلکی تعصبات ہیں۔ دین و مذہب کو درپیش شدید ترین خطرات کے باوجود، اہل دین اپنے اس خصوصی ذوق سے جان نہیں چھڑا سکے۔ مدارس کے نظام سے جو لوگ سرسری طور پر بھی باخبر ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان تعصبات کی بنیادیں ان کے نصابات اور نظام کے اندر ہی موجود ہیں۔ قرآن و حدیث اور سیرت و تاریخ، سب کچھ مزعومہ تصورات اور افکار کے تحت ہی پڑھایا جاتا ہے۔ پورا ماحول بھی اس کے گرد گھومتا ہے۔ نتیجے کے طور پر جو لوگ وہاں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں، یہ تعصبات ان کے اندر گندھے ہوتے ہیں اور ان سے جان چھڑانا ان کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ ان علماء کی عمومی گفتگو ہو یا جمعہ و عیدین اور خاص مواقع کے خطابات، مسلکیت اپنے پورے رنگ اور آب و تاب کے ساتھ موجود ہوتی ہے۔ ہماری آبادیاں ملی جلی ہیں، ہر محلے اور مسجد میں ہر مسلک کے لوگ موجود ہوتے ہیں۔ ایسے میں مسجد کے کسی پروگرام یا اہلِ علم کی مجالس میں اس خاص مسلک کے علاوہ لوگوں کی دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔ سنجیدہ لوگ ویسے بھی ایسی بحثوں کو پسند نہیں کرتے۔ نتیجہ یہ کہ آج ہماری بڑی آبادی مسجد، دینی تعلیم اور تذکیر کے مواقع سے محروم ہو گئی ہے اور لادینی افکار کے لیے آسان شکار بن چکی ہے۔

تیسرا اہم معاملہ تعلیمِ دین اور تفہیمِ دین پر توجہ میں کمی ہے۔ زورِ خطابت اور جوشِ خطابت علماء کی پہچان ہے اور وہ اس پر نازاں رہتے ہیں۔ اس ساری مشق کا اصل مقصود گم ہے۔ نبی ﷺ نے بنا کر بولنے اور قافیے ملا کر دعا کرنے کو ناپسند فرمایا تھا۔ قرآن کی تشریح و تفسیر ہو یا حدیث، سیرت اور تاریخ کا بیان ہو، رنگ آمیزی اور مبالغہ آرائی سے اس حد تک لے جایا جاتا ہے کہ اب عامۃ الناس اسے قابلِ عمل ہی نہیں سمجھتے۔ ان کے ذہنوں میں یہ خیال راسخ ہو چکا ہے کہ دین کے تقاضے صرف چند لوگ ہی پورے کر سکتے ہیں اور یہ صرف انھیں کو کرنے چاہیں۔ یا قرون اولیٰ کے لوگ ہی "فوق الانسان" تھے جو اس پر عمل کر گئے۔ دین آج کی تیز رفتار دنیا کا ساتھ نہیں نبھا سکتا۔ ضرورت تو اس بات کی تھی کہ

- سادہ زبان میں عقائد سمجھائے جاتے جو دینی زندگی کی اساس ہیں کیونکہ آج معاشرتی اور معاشی دباؤ بڑھ رہا ہے، مایوسی اور خودکشی کا رجحان بڑھ رہا ہے اور ڈیپریشن میں اضافہ ہو رہا ہے۔ نفسیاتی امراض بڑھتے جا رہے ہیں۔ ان حالات میں مضبوط عقائد انسان کی دستگیری کرتے ہیں۔ آج دنیا کی مضبوط ترین معیشت والی ریاستوں میں بھی خودکشی کی شرح بلند ترین ہے اور وجہ روحانی ناآسودگی ہے۔
- نبی اکرم ﷺ کی زندگی بطور نمونۂ حسنِ عمل دکھائی جاتی۔ سادہ زندگی، سادہ تر معاشرت، حسن بندگی اور حسن عمل کا نمونہ۔ واضح کیا جاتا ہے کہ یہ قرآن پر عمل کی مثالی زندگی ہے۔ اور ہر انسان کے لیے اس کا اختیار کرنا واجب بھی ہے اور آسان بھی۔ آسانی کی یہ تعلیم دین اسلام اور نبی اُمی ﷺ کا طُرہ امتیاز ہے

"ویضع عنهم اصرهم والا غلل التی کانت علیهم"(۱)

- عبادات کی حکمتیں سمجھائی جاتیں۔ دیگر مذاہب سے ان کا تقابل، امتیازی پہلو، سہولتیں، رخصتیں وغیرہ، تاکہ زندگی میں دینی رنگ جھلکے۔ اس حوالے سے نبی ﷺ کے دور کی طرح بچوں کی غیر معمولی آؤ بھگت کی ضرورت ہے۔
- عالم گیر اخلاقی بحران میں نئی نسلوں کے اخلاق و کردار کی حفاظت کے لیے غض بصر، حیاء کے احکام، خاندانی اور زندگی کے ہر سطح کے باہمی تعلقات میں حقوق و فرائض کی پاسداری کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کرتے تاکہ اسلامی معاشرہ اندرونی طور پر مستحکم ہو اور بیرونی ریشہ دوانیوں کے خلاف خود دفاع کر سکے۔

چوتھا اہم پہلو نبی کریم ﷺ کا خصوصی فرمان ہے کہ:

"حدّثو االناس بما یعرفون"(۲)

کیا بات صرف اہل علم میں کی جانی چاہیے اور عامۃ الناس میں کیا کہنا ہے، ہمارے علماء اس اہم ترین حکمت کو ملحوظ نہیں رکھتے۔ نتیجہ یہ کہ لاحاصل بحثیں عوام کی سطح پر آچکی ہیں، جن میں وہ اپنی جہالت سے مزید مسائل پیدا کرتے ہیں۔ ٹی وی اور اخبارات کی سطح پر پبلک میں نازک دینی اور قانونی مسائل پر غیر محتاط گفتگو اور بحثیں دیکھی جاسکتی ہیں۔

آخری اور اہم ترین سبب اہلِ دین سے دوری کا، وہ علماء بھی ہیں جو حکمرانوں کے حاشیہ نشین بن گئے۔ عہدوں کی حرص میں انھوں نے اپنے آپ کو دنیاداروں سے بڑھ کر دکھایا۔ اگر کوئی انتظامی سیاسی یا مناصب حاصل کیے، وہاں عام طور پر کوئی قابل ذکر اور مثالی کارکردگی نہیں دکھا سکے۔ ایسے علماء مخلص اور بے لوث اہلِ دین کے ساتھ، دین کی بدنامی کا باعث بھی بنے۔ لوگوں میں عمومی تاثر بن گیا کہ دین، دینا کی زندگی اور ملکی انتظام میں کوئی کردار ادا کر سکتا ہے نہ اہل دین اس قابل ہیں کہ دنیاوی معاملات میں ان سے مشاورت کی جائے، یا یہ امور انھیں سونپے جائیں۔

خلاصہ بحث

اہل پاکستان کے لیے یہ بڑی تشویشناک صورت حال ہے کہ چھیانوے فی صد مسلم اکثریت کے اس ملک میں سیکولر رجحانات روز افزوں ہیں۔ ماضی میں ایسے افراد اور گروہ اپنی سیکولر شناخت کو چھپا کر کام کرنے پر مجبور تھے آج بڑی جرأت سے فعالیت کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور صرف بالائی طبقات کی نہیں، بلکہ مڈل کلاس پاکستانیوں کی نئی نسلیں

---

(۱) سورۃ الاعراف: ۱۵۷

(۲) بخاری، صحیح بخاری، کتاب العلم، باب من خص بالعلم قوماً دون قوم، حدیث نمبر: ۱۲۷

بھی تیزی سے ان گمراہ کن افکار کا شکار ہو رہی ہیں۔ اگرچہ سیکولرائزیشن کا یہ عمل ہمہ جہت ہے لیکن اس مقالے میں صرف تین اسباب کے حوالے سے معروضات پیش کی گئی ہیں۔۔۔ پہلا اہم سبب یہ کہ حکومتی سطح پر آج تک کوئی ایسا اہتمام نہیں کیا گیا کہ اسلام کے نظامِ حیات کے نفاذ کی سنجیدہ کوششیں ہوتی اور شریعتِ اسلامیہ کی برکات سے باشندگان ملک مستفید ہوتے اور دنیا بھر کے لیے وطن عزیز اسلامی قانون پر عمل کے حوالے سے قابلِ رشک مثال بنتا۔ تعلیمی نظام اور ان تعلیمی اداروں کے حوالے سے بھی حکومتی تساہل افسوسناک ہے جنھیں اب اہل پاکستان عام طور پر "سیکولرازم کی نرسریاں" کہتے ہیں۔ المیہ یہ بھی ہے کہ ہمارے اہل علم اور اہل دین اس چیلنج کا ادراک اور سدِباب نہیں کر سکے۔ اس حوالے سے چند سفارشات پیش نظر ہیں:

- ہر شعبۂ زندگی سے اہلِ علم کو جمع کیا جائے ایک موثر تھنک ٹینک یا فورم تشکیل دیا جائے جو ایک طرف تو سیکولرازم کے فکری مغالطوں کا علمی سطح پر محاکمہ کرے اور دوسری طرف کی سیکولر سرگرمیوں کے خلاف کے لیے پریشر گروپ بنے۔ خواتین کی این جی اوز پاکستان میں اسی طرح اپنے کام کو آگے بڑھا رہی ہیں۔
- مفسدانہ الحادی افکار کی اشاعت میں مصروف افراد، اداروں اور تنظیموں سے عامۃ الناس کو پرنٹ، الیکٹرانک اور سوشل میڈیا پر آگہی دی جائے اور الحاد کے خطرات سے آگاہ کیا جائے۔
- علمائے کرام اور جامعات وکلیات کے اساتذہ مشترکہ طور پر نئے مسائل اور موضوعات پر دینی نقطۂ نظر کی وضاحت کے لیے بڑے پیمانے پر نوجوانوں کے لیے پروگرام منعقد کریں۔
- مسجد کے ادارے کو معاشرتی سرگرمیوں کا محور ومرکز بنایا جائے، مثلاً نکاح سماجی تقریبات اور مقامی سطح کے اہم معاملات پر مشاورتی اجلاس وغیرہ، جیسا کہ مغرب میں مسلمانوں کے مثبت تجربات ہیں۔ اس سے نوجوان نسل کی مسجد سے دوری ختم ہوگی اور دینی اقدار کو فروغ ملے گا۔ ان شاء اللہ

❁❁❁

العولمة المعاصرة وأثرها على الفكر العربي والإسلامي

Contemporary globalization and its Impact on Arab and Islamic Thought

حسن نصر خميس بظاظو *

* باحث دكتوراه بجامعة الأقصى الحكومية غزة – فلسطين

ملخص البحث: لقد كثر خطر العولمة على هذا العالم؛ فمصطلح العولمة لم تتضح معالمه وأهدافه الخبيثة، ومن خلال هذا البحث تناولت مفهوم العولمة من الناحية اللغوية والاصطلاحية ، وبينت نشأة العولمة المعاصرة والمراحل التي مرت بها حتى وصلت إلى هذه المرحلة، وبدأ هذه المراحل بمرحلة الجينية وانتهت بمرحلة عدم اليقين، ثم بينت وسائل التمكين للعولمة وهي: صناعة الاستبداد السياسي، إبعاد الدين عن الحياة، تعميم التعليم المدني، تنميط الإعلام، تغييب الحريات، الاختراق الثقافي وعولمة المثقفين، الترويج لثقافة التكنولوجيا ، وهذه الوسائل كان لها أثر في تغير واقع الأمة العربية والإسلامية ثم تحدثت عن أثر العولمة على الفكر العربي، لأنه لابد من معرفة أن العولمة مثل السكين لها أثار إيجابية وأثار سلبية فالذي استعملها بما يفيده كان لها أثر إيجابي عليه أما من أخذها على علاتها بما فيها فيكون لها أثر سلبي عليه فالعولمة لها أثر إيجابي وأثر سلبي ، وبينت أثر العولمة على الفكر الإسلامي من وانب عدة مثل: الجانب الديني والاقتصادي والسياسي و الاجتماعي

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين سيدنا مُحَمَّد صلى الله عليه وعلى آله وصحبه وسلم.

فلا يخفى علينا حال الإسلام اليوم وما يعانيه من تكالب الناس عليه؛ فأعداء الإسلام يريدون أن يهدمو الإسلام من داخله، ونهب ثرواته وذلك بتسليط بعض المسلمين عليه تحت مسميات براقة مثل العلمانية والقومية والعولمة فهم تحت هذه المسميات يسرقون ثروات الأمة تحت اسم العولمة ومن هذا المنطلق كان عنوان هذا البحث: "**العولمة المعاصرة وأثرها على الفكر العربي والإسلامي**"

أهداف البحث

١. بيان مفهوم العولمة المعاصرة.
٢. بيان نشأة العولمة.
٣. بيان أثر العولمة على الفكر العربي والإسلامي.

أهمية البحث

١- تنبع أهمية البحث من موضوعه.
٢- بيان أثر العولمة على الفكر العربي والإسلامي.

خطة البحث

المبحث الأول : العولمة ونشأتها
المبحث الثاني: أثر العولمة على الفكر العربي .

المبحث الثالث: أثر العولمة على الفكر الإسلامي.

المبحث الأول:العولمة ونشأتها

لقد كثر الحديث عن العولمة ليس فقط في الجامعات بل في وسائل الإعلام لما لها من خطر عظيم على هذا العالم؛ فالجميع يخشى من هذا المصطلح الجديد الذي لم تتضح معالمه وأهدافه الخبيثة التي ظهرت بمظهر براق باسم العولمة، ومن خلال هذا المبحث سنبين أصل هذه الكلمة ونشأتها من خلال هذا المبحث:

المطلب الأول: تعريف العولمة

العولمة لغةً: ظاهرة العولمة من الظواهر الحديثة التي لم يكن لها أصل، فالباحث في معاجم اللغة العربية القديمة عن كلمة العولمة وصيغها يجد أن هذه الصيغة الصرفية لم يجد لها أصل عند العرب؛ لأنها من المسميات المعاصرة الدخيلة علينا، ويؤكد هذا الشيخ القرضاوي بقوله: "العولمة مصطلح من المصطلحات التي شاعت بيننا في هذه السنين ... وهو تعبير جديد على لغتنا فهو مترجم قطعا كما سنرى" [(١)] لكن الشيرازي قال: "العولمة ثلاثي مزيد، يقال: عولمة على وزن قولية، واللفظ مشتق من العالَم جمع لا مفرد له كالجيش والنفر، وهو مشتق من العلامة على ما قيل، وقيل مشتق من العلم وذلك على تفصيل مذكور في كتب اللغة، فالعولمة كالرباعي في الشكل فهو يشبه (دحرجة)المصدر، لكن (دحرجة)رباعي منقول، أما العولمة فرباعي مخترع إن صح التعبير"[(٢)]، فمثلاً قولبة، مشتقة من قَالَب، فكلمة "العولمة "-بفتح العين- نسبة إلى العَالم أي الكون، وليس إلى العِلم -بكسر العين-، والعولمة لم يعرف لفظها العرب، وحاجة العصر قد تفرض استخدامها، وتعني تحويل الشيء إلى شكل آخر، بمعنى: ان جعل الشيء على المستوى العالمي ومما أدى بها أن تكون مستخدمة عند المثقفين في معظم الدول العربية.[(٣)]

وبين الدجاني اشتقاق العولمة من الفعل عولم بصيغة فوعل ويفيد أن اشتقاق الفعل يريد لوجود فاعل يفعل، أي أنّ العولمة تحتاج لمن يعممها على العالم.[(٤)]

---

(١) د.يوسف القرضاوي،المسلمون والعولمة،دار النشر والتوزيع الإسلامية،الطبعة الأولى:٢٠٠٠م،ص:٥

(٢) المجدد الشيرازي الثاني،فقه العولمة دراسة إسلامية معاصرة،مركز نور مُحَمَّد ﷺ،بيروت، الطبعة الثانية:٢٠٠٢م، ص:٣١

(٣) الجابري،الدكتور مُحَمَّد عابد،العرب والعولمة،مركز دراسات الوحدة العربية،بيروت،١٩٩٨م،ص:١٣

(٤) الدجاني،أحمد صدقي،مفهوم العولمة وقراءة تاريخية للظاهرة،جريدة القدس،٢/٦ /١٩٩٨م،ص:١٣

يقول الدكتور خليل حسين: "وقد قرّر مجمع اللغة العربية بالقاهرة إجازة استعمال العولمة بمعنى جعل الشيء عالمياً؛ والعولمة ترجمة لكلمة Mondialisation الفرنسية، بمعنى جعل الشيء على مستوى عالمي، والكلمة الفرنسية المذكورة إنّما هي ترجمةGlobalization الإنكليزية التي ظهرت أولاً في الولايات المتحدة الأميريكية، بمعنى تعميم الشيء وتوسيع دائرته ليشمل الكل ؛ فهي إذا مصطلح يعني جعل العالم عالمًا واحدًا، موجهًا توجيهًا واحدًا في إطار حضارة واحدة، ولذلك قد تسمى الكونية أو الكوكبة.

وبهذا المعنى اللغوي يمكننا القول أنّ العولمة إذا صدرت من بلد أو جماعة فإنها تعني: تعميم نمط من الأنماط التي تخص ذلك البلد أو تلك الجماعة، وجعله يشمل الجميع أي العالم كله. وقد جاء في المعجم العالم الجديد ويبستر WEBSTER أنّ العولمة Globalization هي: إكسابُ الشيء طابعَ العالمية، وبخاصة جعل نطاق الشيء، أو تطبيقه، عالمياً." (١)

ومما تقدم يتضح أنه يصعب على الباحثين حصر مصطلح العولمة في تعريف جامع للعولمة لكثرة الرؤى حولها ، وكل من عرف العولمة عرفها حسب اتجاهه وموقفه منها ، كما سيظهر بعد قليل.

العولمة اصطلاحاً: عرفها د. رضا أمين بقوله: "العولمة هي ظاهرة حديثة نسبيا تشير إلى محاولات تصغير العالم ودمجه، من خلال التقليل من أهمية الحدود الجغرافية والسياسية، وتتيح إمكانية الاتصال والتواصل بين الأفراد والمجتمعات، نشأت في مجال الاقتصاد وتعدته إلى المجالات السياسية والثقافية والاجتماعية، وساعد على انتشارها ثورة تكنولوجية واجتماعية ورغبة سياسية وتمثل في أحد جوانبها – في الوقت الراهن على الأقل – هيمنة للقيم الغربية بصفة عامة، والأمريكية بصفة خاصة". (٢)

وعرف مالكولم العولمة بقوله:"عملية اجتماعية تتلاشى فيها حدود الجغرافيا وتذوب فيها حواجز ثقافية وتزداد فيها فرص الاندماج بين الشعوب".(٣)

وعرفها أحدهم بقوله:"نظام عالمي يقوم على العقل الإلكتروني والثورة المعلوماتية القائمة على المعلومات والإبداع التقني غير المحدود دون اعتبار للأنظمة والحضارات والثقافات والقيم والحدود الجغرافية والسياسية القائمة في العالم"(١)

---

(١) مقال اصل العولمة وآثارها د. خليل حسين موقع "ميدل ايست أونلاين،http://www.middle-east-online.com/?id=32000

(٢) رضا عبد الواجد أمين،الإعلام والعولمة،دار الفجر للنشر والتوزيع،الطبعة الأولى:٢٠٠٧،ص:٥٥

(٣) د. عباس أبو شام عبد المحمود ود .محمّد الأمين البشري،العنف الأسري فيظل العولمة،جامعة نايف العربية للعلوم الأمنية،الطبعة الأولى:٢٠٠٥،ص:٩٣

وعرفها أ.د. صالح الرقب بقوله: "العولمة هي الحالة التي تتم فيها عملية تغيير الأنماط والنظم الاقتصادية والثقافية والاجتماعية ومجموعة القيم والعادات السائدة وإزالة الفوارق الدينية والقومية والوطنية في إطار تدويل النظام الرأسمالي الحديث وفق الرؤية الأمريكية المهيمنة، والتي تزعم أنها سيدة الكون وحامية النظام العالمي الجديد".(٢)

ومن خلال التعريفات السابقة يصعب الوصول إلى تعريف دقيق للعولمة لأن البعض ينظر إليها من جانب اجتماعي، والبعض من جانب سياسي أو ديني أو اقتصادي وقد ذكر أ.د. أحمد على الحاج مُحَمَّد سبب عدم التوصل إلى مفهوم واحد بقوله: "ويصعب التوصل إلى تعريف جامع مانع للعولمة لأسباب عديدة أبرزها: الحداثة النسبية للعولمة، مفهوما ومغزى، تباين آراء ومواقف العلماء والمفكرين والباحثين والمهتمين بها، والتعريفات المهولة للعولمة، المغرضة تارة والمضللة تارة ثانية التي يقدمها منظرو العولمة الغربيين، ومن يسير في ركبهم والمحايدة تارة ثالثة، والمعارضة لها تارة رابعة ، والتعريفات التي حاولت التوفيق بين التعريفات القائمة أو وقفت موقفاً وسطاً تارة خامسة، فضلا عن الأوساط الفكرية والبحثية تعرفها من زاوية تخصصها وبمدى اطلاعها على خباياها النهائية، ثم إن كلا من أوساط المجتمعات التقليدية تفهمها من زوايا النتائج التي تحدثها في المجتمع والفوائد التي تجنيها منها، المخاطر التي تهدد وجودها وبجانب هذا وذاك تتنوع سياسات وأساليب القوى العالمية التي تقف خلفها والأيادي التي تنسج خيوطها والمبررات التي تطرحها، وتتعدد الجهات التي تستفيد منها ومن ثم تروج لها وتدافع عنها مما جعل مفهوم العولة يشوبه الكثير من الغموض والهلامية في تحديده".(٣)

وخلاصة القول أن تعريف الرقب هو أجمع التعريفات للعولمة لأنه حاول حصر أنواع العولمة من خلال تعريفه .

المطلب الثاني:نشأة العولمة المعاصرة

الدارس لظاهرة العولمة المعاصرة يرى أنها ليست ظاهرة جديدة، بل أن بداياتها ترجع إلى قبل خمس قرون، وهذا بعد أن بدأت عملية الاستعمار الغربي لأسيا وأفريقيا كما بين ذلك د. كمال الدين

---

(١) بكار،أ.د.عبد الكريم،العولمة طبيعتها،وسائلها ،تحدياتها،التعامل معها،دار الإعلام،الأردنية،الطبعة الثالثة: ٢٠١٣م، ص:١١

(٢) الدكتور صالح الرقب، بين عالمية الإسلام والعولمة،تم عرضه في مؤتمر "التربية في فلسطين ومتغيرات العصر،عام:٢٠٠٤،ص:٧

(٣) أ.د. أحمد على الحاج مُحَمَّد،العولمة والتربية أفاق مستقبلية، وزارة الأوقاف،القطرية، الطبعة الأولى:٢٠١١م،ص:٣٧

عبد الغني المرسي حين قال:"والعولمة ليست حدثا بذاته يمكن التأريخ له ولكنها تحققت بفعل مجموعة من العوامل السياسية العالمية بر العقود الخمسة عشر الماضية"[١] ، ويرى د. نبيل راغب أن العولمة بدأت بعد انهيار الاتحاد السوفيتي وأكدب أنه منذ ظهور البشرية لم يكن هناك أحد من أصحاب التيارات سواء كانت هذه التيارات سياسية أو فكرية أو اقتصادية أو ثقافية أو اجتماعية ، أدى إلى البلبلة والفوضى وجعل الناس في حيرة وقلق إلا في تيار العولمة، فهو الذي لم يجيده أحد من المفكرين أو الفلاسفة وقدم للناس بأنه نظرية أو مذهب جديد هدفه جمع العالم في منظومة متكاملة، نتجت نتيجة طبيعية لانهيار الاتحاد السوفيتي، وانتهاء العصر الماضي، وبعد التطور العلمي في الثورة المعلوماتية أصبح العالم كأنه قرية صغيرة، ومما أدي إلتضخم وتطور الشركات للشركات الكبيرة صاحبة النسيات المختلفة ،وحين ظهرت علامات هذا التيار بالظهور في أوائل التسعينيات أسرع المفكرون أصحاب المالات المختلفة إلى تقنينهامن خلال إطار ممنهج متبلور وكان الهدف من ذلك تقديم العولمة على أنها نظرية حتمية لا يمكن الاستغناء عنها على المستوى التطبيق الدولي.[٢]

ومنهم من يرى أن هذه الظاهرة مرت بعدة مراحل حتى وصلت إلى هذه المرحلة، وبدأ هذه المراحل بمرحلة الجينية وانتهت بمرحلة عدم اليقين، وهي كالتالي:

المرحلة الأولى الجينية:واستمرت في أوربا منذ ١٥قبل الميلاد إلى منتصف ١٨ قبل الميلاد، وهنا تتبلور ظهرت صور المجتمعات القومية، وبومن خلال ذلك بدأ ظهور الأفكار الخاصة بالفرد والإنسانية والعالم، ثم نشطت الجغرافيا الحديثة في اكتشاف العالم ومما جعل هذه البداية هي الأولى للتفاعل.

المرحلة الثانية النشأة:وكانت في أوربا من نصف القرن الثامن عشر قبل الميلاد إلى ١٨٧٠ميلادية، وهذا جعل المفاهيم المختصة بالعلاقات الدولية تنكمش، وحتى يظهر لتحديد الإنسانية كما يريدون ،مما أدى إلى ازدياد الاتفاقات الدولية، ومن خلال هذا كان مفهوم القومية والعالمية والمجتمع الدولي له أهمية كبيرة في هذه المرحلة ، ومما أدى إلى التفاعل من خلال المرحلة الأكثر تقدما ويشهد لذلك شيوع العلاقات الدولية كمصطلح ، وفكان التفاعل بين الدول بعضهم البعض أو الأفراد من خلال الدول.

المرحلة الثالثة الانطلاق:وبدأت عام١٨٧٠م إلى ١٩٢٠ وكان الانطلاق بمصطلحات عالمية منها: "المجتمع القومي" وهذه المصطلحات لها علاقة بالهوية القومية الشخصية، وتم ادخال جزء من المجتمعات

---

(١) الخروج من فخ العولمة،ص:١٣

(٢) د. نبيل راغب، أقنعة العولمة السبعة، دار غريب،القاهرة،الطبعة الأولى:٢٠٠١،ص:٥

غير الأوربية في للمجتمع وبدأت الدول تتفاعل في إطار المحدد لها، وذلك بصياغة الأفكار التي تخص الإنسان والعمل على محاولة تطبيقها مما جعل عجلة التطور تسير بسرعة هائلة في أنواع الاتصال، وخلق جو للمنافسة الكونية مثل الألعاب والجوائز، وهذا التفاعل كان درجته متقدمة في هذه المرحلة .

المرحلة الرابعة الصراع من أجل الهيمنة: وبدأت بعد عام١٩٢٠ إلى عام١٩٦٥ وهذا أدى إلى ظهور الحروب الفكرية و الخلافات لفهم عملية العولمة والتي في انطلاقها بدأ ينشأ الصراعات كونية لطبيعة الحياة وصورها المختلفة ومع التركيز على الأمور الإنسانية وبحكم حوادث إلقاء القنبلة الذرية ، وهذا أدى إلى ظهور الأمم المتحدة دورها في استقلال بعض دول العالم، لتدخل في النظام الدولي وهذا بداية الاعتراف بها كدول مستقلة، وفكان التفاعل بداية في ما بينها وبين الدول الأربية ، وفي هذه المحلة ظهرت الدول بصورة الدول المحررة لكن الحقيقة أن الدول الكبرى هي من تحركها.

المرحلة الخامسة عدم اليقين:استمرت من الستينات وظهر فيها بعض الأزمات واتجاهات في التسعينات، وفي هذه المرحلة زرعت قيم جديدة وشهدت نهاية الحرب الباردة وزادت المؤسسات والحركات العالمية، وظهرت الثورة المرتبطة بالتكنولوجي ومما أدى إلى تفاعل بشكل كبير بين الدول والمؤسسات وبين الأفراد بعضهم البعض.[١] وفي هذه المرحلة أصبحت المفاهيم المتعلقة بالأفراد معقدة جدا من خلال الاعتبارات المتصلة بالجنس والسلالة كما ظهرت جماعة تنادي بالحقوق المدنية ،وترسخ الاهتمام بالبشرية كمجتمع يضم أنواع وأصبح النظام العالمي سيولة أكثر من السابق وانقضى النظام الثنائي القومي، وزاد الاهتمام بالمجتمع المدني العالمي والمواطنة العالمية ودعم نظام الإعلام الكوني.[٢]

يتضح مما سبق أن هذه المراحل قُصد بها المرور بتاريخ العولمة القديمة والحديثة ، لكن العولمة الحديثة بدأت بعد المرحلة الثالثة وكانت هذه المرحلة عبارة عن نقطة انتقال من العولمة القديمة إلى العولمة المعاصرة وبعدها بدأت مرحلة الهيمنة على العالم بعد أن انهيار الاتحاد السوفيتي وبدأت العولمة تتضح معالمها وتسير بجلاء ووضوح لتحقق أهدافها الت أسست من أجلها.

المطلب الثالث:وسائل التمكين للعولمة

(١) العولمة الكراسة الخامسة إعداد المركز المصري لحقوق المرأة ،ص:١٦-١٩

(٢) د. رأفت دسوقي،عولمة المدير في العالم النامي، دار العلوم للنشر والتوزيع، الطبعة الأولى:٢٠٠٦،ص:١٦

لقد اتخذت وسائل متعددة لتمكن العولمة من الانتشار داخل المجتمعات وتفرض سيطرتها عليها، وقد قام دعاة العولمة إلى تهيئة الأجواء المناسبة لتمكين العولمة التي يريدها من خلال وسائل متعددة ليسيطر على المجتمع وفكره وثقافته وسياسته وصناعته فكانت أهم الوسائل هي:

١. صناعة الاستبداد السياسي.
٢. إبعاد الدين عن الحياة.
٣. تعميم التعليم المدني
٤. تنميط الإعلام
٥. تغييب الحريات
٦. الاختراق الثقافي وعولمة المثقفين
٧. الترويج لثقافة التكنولوجيا[١]

صناعة الاستبداد السياسي

والمقصود بالاستبداد السياسي هنا التدخل في الشؤون السياسية للدول الضعيفة والسيطرة على مقدراتها ونهب خيراتها لصالح الدول القوية وذلك من خلال السيطرة على النظام السياسي في تلك الدول وذلك من خلال اغراق هذه الدول بالديون وجعل الأنظمة تتبع لهذه الدول من خلال انشاء صندوق النقد الدولي والبنك الدولي، يقول د.عبد الكريم بكار: "أدرك العالم الغربي القوي والمتنفذ بعد الحرب العالمية الثانية أن الاستعمار العسكري قد فات أوانه ، حيث نشأت في العالم مفاهيم جديدة لاستثمار القوة وانتقل حقل استخدام القوة من السياسة واستخدام السلاح إلى المال والأعمال والاستثمار والتنمية الاقتصادية ، وحتى يحافظ الغرب على مواطئ أقدامه وعلى رعاية مصالحه ، شرع في إنشاء الأطر والمؤسسات الدولية على المستويات القانونية والسياسية والاقتصادية والثقافية وقد أنشأ على مستوى التمويل للأنشطة والمشروعات الدولية مؤسستين مهمتين هما صندوق النقد الدولي والبنك الدولي"[٢]

إبعاد الدين عن الحياة

(١) عمر عبيد حسنه،العولمة فرص وتحديات، المكتب الإسلامي،بيروت، الطبعة الأولى:٢٠٠٤،ص:٣٥-٤٤

(٢) أ.د. عبد الكريم بكار،العولمة طبيعتها، وسائلها، تحدياتها، التعامل معها، دار الإعلام،الأردن، الطبعة الثالثة: ٢٠١٣م،ص:٥٤

ويكون ذلك من خلال تصفية الإسلام من مضمونه وذلك من خلال "استبعاد الإسلام وإقصاؤه عن الحكم والتشريع، وعن التربية والأخلاق ،وإفساح المجال للنظم والقوانين والقيم الغربية المستمدة من الفلسفة المادية والعلمانية، وتحويل المناسبات الدينية إلى مناسبات استهلاكية ، وذلك بتفريغها من أقيم والغايات الإيمانية إلى قيم السوق الاستهلاكية"(١) فيكون فقط الدين داخل المسجد أو الكنيسة ولا دخل له بالحياة العملية داخل المجتمع.

تعميم التعليم المدني

وهو أن العلوم الحديثة لا يشمل التعليم الديني ، وإن أردت أن تعلم التعليم الشرعي يجب أن تتبع النظام المدني لأنه هو الذي يؤدي إلى التحضر، فبدون التحضر لا يكون حرية فكرية لهذا الأمر لا نستفيد من تعديل للمناهج إذا لم نعطي الحرية للتفكير ونشجعها ، فعلينا أن نشرك كل من المرسل والمستقبل في صياغة الرسالة التعليمية حتى يكون التعليم صحيح، والذي يعيننا في ذلك هو الغرب فلا يمكن الاستغناء عن أفكاره، فلا بد من أن يدعمنا بالكوادر المثقفة بدعوى أن كوادرنا التعليمية أصبحت غير مؤهلة للتعليم المدني ، إذا يجب استعمال طرق تعليم حديثة لأن من عندنا من الكوادر أصبحوا ممن يعلمون باستخدام عملية التلقين ويرفضون الطرق الحديثة ، ، وبهذا نعود إلى نقطة الصفر وكمن يفكك الآلة ويحاول أن يخترعها من جديد. (٢)

تنميط الإعلام

ويكون تنميط الإعلام من خلال إصدار حكم ما لشخص ما من الأشخاص الذين ينتمون إلى فكرة أو جماعة خاصة–مثل من ينتمي إلى بلده أو مدينته أو ثقافته–. و هذا النمط في طبيعته يؤدي إلى صورة ثابتة في الذهن وتبقى في الذاكرة عن الآخرين، ونقوم بتطبيقها في الواقع على كل فعل من الأفعال في أكثر المواقف التي يتم التفاعل فيها مع فرد أو أكثر لأنهم ينتمون إلى مجموعة ما.

يقول د. نبيل راغب:"فقدت حكومات ودول عيدة سيطرتها على قطاعات وفئات من مواطنيها وظهرت بالتالي جماعات عرقية ودينية رأت فيما يحدث نوعاً من الغزو الفكري الذي يستهدف محو الشخصية القومية للشعوب المستضعفة ليجعلها مسخاً دائراً في فلك الأقوياء القادرين. وارتدت هذه الجماعات أقنعة براقة هي الأخرى في مواجهة أقنعة العولمة الإعلامية، وتمثلت في العودة إلى أصول عرقية

---

(١) ثقافة الداعية في عصر العولمة إعداد شكري مانلين الناشر كلية الدعوة الإسلامية ماليزيا،ص:٧

(٢) مقال التعليم المدني د. أحمد البغدادي،http://www.awtad.cc/articles/43-cultural-issues/70-2010-11-29-14-38-11.html)

أو عقائدية أو تراثية والاعتصام بها والدفاع عنها .ووجدت الدعوة الملتهبة صدى عند الكثيرين الذين شفت غليلهم جبروت العولمة وغطرسها، فشعروا أنهم جنود في حرب مقدسة ضده، وسرعان ما ازداد مؤيدوها وانتشروا كالنار في الهشيم، وبعد أن استخدموا بدورهم أجهزة الإعلام وفي مقدمتها شبكة الانترنت تحولوا إلى استخدام السلاح لفرض إرادتهم خاصة أن هناك من تجار السلاح في الغرب من يمدهم بأحدث الأنواع وأكثرها كفاءة لترويج الإنتاج الجديد وتجربته في حروب حية حقيقية ثم تطويره، وهكا في دائرة جهنمية لا تتوقف، بل وأنشأ الأمريكيون لهم معسكرات لتدريبهم على هذه الأسلحة."[١]

وهذه هي الحقيقة المرة التي تعيشها الآن معظم الدول الإسلامية المحاربة من قبل الغرب تحت مسمى الإرهاب، فلو كان هذا صحيح فأين هم عما يدور في بورما وسوريا وفلسطين واليمن والعراق...وغيرها والله المستعان.

تغييب الحريات

والهدف من تغييب الحريات هي أن يقبل الإنسان بما يأتيه دون أن يفكر أو يعرف ما هي عواقب أو فوائد من هذا، فعليه أن يسلم بما يملى عليه من غيره بسبب تبعيته له يقول د. مصطفى النشار:"إن بشائر الأمل في التقدم تكون حقيقية عندما يسمح لهذا الجيل أن يعبر عن ذاته دون الواسطة والمحسوبية وقلة الإمكانات... إلخ، فهذا الجيل هو بحق جيل القرن الواحد والعشرين فهو إن أحسنا فتح الطرق أمامه وسلحناه بالإمكانات المادية وبالقيم الخلقية والدينية المناسبة لصنع التقدم والتحديث... ولا يمكن بالطبع أن يتم هذا بدون إرادة سياسية واعية بمتطلبات مرحلة التحول نحو الديمقراطية الحقيقية لا الديمقراطية الكلام والكلام فقط ،وإنما الديمقراطية التي تسمح حسب الإرادة الشعبية بتداول السلطة بين الأحزاب التي تعبر عن مبادئ أكثر ليبرالية وأكثر إيمانا بالتقدم والتي تكون أكثر قدرة على إفراز زعامات جديدة واعدة متسلحة بالإيمان بقضية الشعب الطامح إلى صنع الغد الأفضل لمواجهة التحدي الحضاري الذي لا نزال فيه رغم كل ما تحقق من إنجازات محلك سر."[٢]

وهذا يعني بالتغيب أن يكون المسؤولين والحكام ليس لهم حرية لأن حريتهم مرتبطة بمن يقوم بوضعهم فلا يستطيع أن يخالف الأوامر الملقاة على من عينه باسم الديمقراطية المزيفة.

الاختراق الثقافي وعولمة المثقفين

---

(١) د. نبيل راغب،أقنعة العولمة السبعة،ص:٣١٠

(٢) د. مصطفى النشار،ما بعد العولمة دراسة في مستقبل التفاعل الحضاري وموقعنا منه،دار قباء،القاهرة، الطبعة الأولى:٢٠٠٣،ص:٢٥٣

أي أن تسيطر العولمة على ثقافة الطبقة المتعلمة التي يعتمد عليها في المستقبل، ويكون التواصل معهم من خلال الشبكة العنكبوتية، لأنهم هم من يخشى عليهم فيقوم الرب بعمل استنساخ على عقولهم، وهذا ما يخاف منه أن يصبح المثقفون من أصحاب العولمة ينادون بها ويدافعون عنها فيصبحوا من أصحاب الصف الأول في الذي يقوم بالدفاع عنها، وبذلك يكون الغرب نجح في صناعة بعضهم كنسخ أصلية باسم الثقافة ليقوموا بخيانة ثقافة الأمة؛ فيصاب المثقفون بقصر نظر حتى لا يرى إلا بعين تنظر إلى الجوانب المختلفة للحياة من الاقتصاد والتنمية والتجارة والاستهلاك أمر يؤدي إلى رؤية غير واضحة يتعامل معها، في مجال الاتصالات والتقنيات الحديثة بمختلف أشكالها مما يجعله يوظفها في خدمته في نهاية المطاف.(١)

الترويج لثقافة التكنولوجيا

الناظر إلى التكنولوجيا وما أحدثت من تغير على عقول البشر يرى أن العولمة تتحكم فيه فتُوَجِهُه يسرتاً ويمنة، فهي ظاهرة صارت تدخل بغير استئذان إلى المجتمعات النامية وتفرض عليها نظاما عالميا جديدا للثقافة وللتبادل الثقافي، وهو نظام قادر على النفاذ إلى منظومات القيم والمبادئ والتراث الثقافي في هذه المجتمعات ولأنه يملك قدرة النفاذ الصادمة، فإنه يثير ضجي واهتزاز صاعق في الشكل والمضمون مما يضعف فرصة التفاعل والاستجابة الممثلة للواقع.(٢)

وهذه هي أهم الوسائل التي استطاعت العولمة من خلالها التحكم في هذا العالم وكان لها أثر في تغير واقع الأمة العربية والإسلامية كما سنرى في المبحث التالي.

(١) عمر عبيد حسنه،العولمة فرص وتحديات، المكتب الإسلامي،بيروت،الطبعة الأولى:٢٠٠٤،ص:٤٣

(٢) د.شمسي،العولمة وتهافتها الثقافية،واقف زاده بدون طبعة ودار نشر،ص:١٩٠-١٩١

المبحث الثاني:أثر العولمة على الفكر العربي

للعولمة أثر واضح على الفكر العربي، ويكمن هذا الأثر من خلال جعل شروط العولمة فريضة على العرب، لكن من منظور مختلف ، بمعنى من وجهة نظر المستعمر حتى لا هناك أي مصلحة للعرب أو أي أثر، لأن الفكر العربي لم يأت بنمط يتعامل مع العولمة المعاصرة سواء كان ذلك النمط سلباً أو إيجابياً.

لابد من معرفة أن العولمة مثل السكين لها أثار إيجابية وأثار سلبية فمن استعملها بما يفيده كان لها أثر إيجابي عليه أما من أخذها على علاتها بما فيها فيكون لها أثر سلبي عليه فالعولمة لها أثر إيجابي وأثر سلبي وهي كما يلي:

الأثار السلبية للعولمة هي:

أولاً: التحدي الحقيقي للهوية العربية ثقافتها هي عولمة ، وهذا التحدي يكون من خلال انتشار العديد من المظاهر المعنوية والمادية و الغير مرتبطة بالثقافة وهويتها العربية عند كثير من أولاد الأمة العربية.(١) فهي تقوم بسحق الهوية والشخصية الوطنية المحلية، وإعادة صهرها وتشكيلها في إطار هوية وشخصية عالمية، أي الانتقال بها من الخصوصية الخاصة إلى العمومية العامة.

ثانياً:جعلت العولمة الثقافة العربية موسومة بالثقافة الاستهلاكية وهذا من خلال جعل الشعوب العربية عبارة عن شعب استهلاكي كما يريد الغرب وذلك من خلال اعتماد الدول الصناعية على دول العالم الثالث كسوق لتصريف منتجاتها وكمجال للاستثمار الأمر الذي سمح بدور أكبر لها في العالم الثالث.(٢)

ثالثاً: أضعفت العولمة اللغة العربية وذلك من خلال استخدام اللغة الانجليزية وتعميمها، وذلك باستخدام اللغة الإنجليزية في جميع مناحي الحياة فالطالب يستخدمها في المدرسة والأم تستخدمها في البيت والمدرس يستخدمها في الامعة والمذيع في الإعلام والكُتاب في تأليف كتبهم وتهميش اللغة العربية الأم.(٣)

رابعاً:قامت العولمة بتحويل الثقافة العربية إلى ثقافة مضمونها حب الكسب والإيقاع الغير بطيء والتسلية الآنية وإدخال السرور على النفس وملذات النفس وتهيج غرائز الأمة ،وهذا جعل دور الأسرة يتراجع، فأصبحت الأسرة مفككة البنيان، حتى أن الأسرة فقدت قوتها على أن تكون المرجع لقيم وأخلاق

(١) د. أحمد درويش،ثقافتنا في عصر العولمة، الشركة المصرية العالمية للنشر، الطبعة الأولى:٢٠٠٣م،ص:٣٨-٤٠

(٢) د. رأفت دسوقي،عولمة المدير في العالم النامي، دار العلوم للنشر والتوزيع،الطبعة الأولى:٢٠٠٦،ص:٢٩

(٣) مُحَّد الشحري،بتصرف مدى اسهام معلم المرحلة الثانوية في مواجهة التحديات الثقافية للعولمة، رسالة ماجستير نوقشت١٤٣٠ في جامعة أم القرى،ص: ٧٨

الناشئة[١] وذلك من خلال إيجاد حالة اغتراب ما بين الإنسان والفرد، وتاريخه الوطني، والموروثات الحضارية و الثقافية التي أنجبتها حضارة الآباء ومن علاهم، بمعنى فصل الفروع عن أصولها المتجذرة، وفصل البناء وذلك من خلال جعل السطح لا علاقة له بالأعماق، وإيجاد نوع جديد من أنواع وأشكال الثقافة العالمية التي أسسها البشر ككل وهذا لايخص أشخاص بعينهم أو إحدى المناطق الجغرافية بذاتها.

خامساً: اخفيت العديد من العادات والتقاليد بفعل العولمة التي كان لها الأثر في تجفيف التواصل وقطع صلة الرحم و أبدلت زيارات الأحباب فجعلتها في حدود ضيقة بسبب الاهتمام بالربح المادي [٢]

سادسا: لما كانت العولمة جذورها أجنبية قامت بفرض وصايتها لأنها تعتبر أن الأجنبي متقدما كثير فيكون له قوة تحكم يستطيع أن يستعملها لأن له نفوذ في المنطقة وبهذا يستطيع أن يقلل من قيمة كل ما هو محلي والتخلص من إنتاجه وفوائده مع اتباع القهر وممارسته في شكل موجات مستمرة ومتتابعة ومتصاعدة، حتى ليقف المجتمع العربي عن محاربة العولمة والاستسلام لها ومن خلال النزول لمطالبها والاستجابة لكل ما تقدمه.[٣]

الآثار الإيجابية للعولمة

يقول د. الحبيب الجنحاني: "إن ظاهرة العولمة إيجابية ، وتعد خطوة نوعية جديدة في تقدم المجتمع البشري رغم جوانبها السلبية، ورغم الوعي بأن ضرر النتائج السلبية سيصيب المجتمعات السائرة في طريق النمو أولا وبالذات"[٤]

١- ربطت العولمة من خلال الاتصالات بين المجتمع وأفراده الذين يعيشون في عالم الواحد، وذلك من خلال استعمال وسائل الاتصالات الحديثة في الاتصال والتواصل مع بعضهم البعض، وهذا يؤدي إلى تقوية الترابط الاجتماعي في المجتمع الإسلامي.[٥]

---

(١) وجدي شفيق عبد اللطيف،عولمة الإعلام والتغيير في المجتمع القروي دراسة حالة لقرية مصرية،الطبعة الأولى: ٢٠٠٦،ص:٥٠-٥٦

(٢) المرجع السابق،ص:٤٨

(٣) د.رأفت دسوقي،بتصرف عولمة المدير في العالم النامي، دار العلوم للنشر والتوزيع،الطبعة الأولى: ٢٠٠٦،ص:٣١

(٤) د. الحبيب الجنحاني،العولمة والفكر العربي المعاصر، دار الشروق، الطبعة الأولى:٢٠٠٢،ص:٢٤

(٥) د.عبد العزيز برغوت،الشهود الحضاري للأمة الوسط في عصر العولمة، وزارة الأوقاف القطرية، الطبعة الأولى: ٢٠٠٧،ص:٩٢

٢- طورت العولمة المصالح الدولية وذلك من خلال جعل الأسواق واحدة في العالم فيمكن للشخص من أي مكانفي العالم يصل إلى ما يريد مع تجاوز جميع الحواجز والمعوقات التي تفصل بين دول العالم فيجعل كل ما لديها من معابر تحت المصالح التي يشترك ويستفيد منها الجميع.(١)

٣- تقوم العولمة على باختيار منضبط للمتفوقين تفتح المجال أمامهم في الأسواق وهذا يزيد من خبراتهم وكفائتهم، وفي نفس الوقت يحفز الغير على الحرص على تحقيق تقدم وتفوق أكثر.(٢)

٤- تحاول العولمة أن تعمل على تسريع التكنولوجيا المتطورة تطبيقاتها بتطورها السريع المتلاحق.. لأنها فرصة كبيرة لمن يريد أن سيتفيد من هذا التطور وبكامل الفاعلية.

٥- توفر العولمة الفرص من أجل الوصول إلى المعرفة العامة التي يملكها الآخرين في المجالات المتنوعة كالمجال الاقتصادي، السياسي و الثقافي والاجتماعي.(٣)

المبحث الثالث:أثر العولمة على الفكر الإسلامي

أثر العولمة في الجوانب الدينية

لقد كان للعولمة أثر كبير في خلخلة بعض الاعتقادات الدينية لدى المسلمين ،وذلك من خلال التشكيك في العقائد وهدم الأماكن المقدسة عندهم، والهدف من ذلك خدمة الفكر الغربي الذي لا يؤمن برب ولا يقوم على دين، فيقوم على الفلسفات الغربية المخالفة للإسلام ويجعله بدلاً من المعتقد الإسلامي الصحيح ، الذي يؤدي إلى ضعف الولاء والبراء في نفوس المسلمين فيما بينهم، فيكون معيار الحب والكره بين المسلمين هي المادة فيكون حب المسلم للمسلم على أساس مدى الاستفادة منه لا على أساس دينه وعقيدته.(٤)

جعلت العولمة بعض المسلمين يتبعون النصارى في عقيدتهم من خلال تقليدهم في أعمالهم، هذا ادى إلى انتشار كثيرٍ من تقاليد النصارى وعادتهم المحرَّمة التي لا تتناسب مع روح الإسلام السمح، فهذه

---

(١) د.ماهر عبد القادر محمَّد،معالم على طريق الفكر العربي المعاصر، دار الثقافة العلمية،الطبعةالأولى:٢٠٠٢م، ص:٨٧

(٢) د.فهد بن سلطان السلطان،الجامعة فيعصر العولمة، مكتبة الملك فهد الوطنية،الرياض، الطبعةالأولى:٢٠٠٨،ص: ١١١

(٣) د.الحبيب الجنحاني،العولمة والفكر العربي المعاصر، دار الشروق،الطبعةالأولى:٢٠٠٢،ص:٢٦

(٤) د.عبد القادر صوفي،آثار العولمة على عقيدة الشباب،إدارة الدعوة والتعليم السعودية، الطبعة الأولى:٢٠٠٦، ص:١٢

العادات والتقاليد أحيانا تقدح في صلب عقيدة المسلم وهو لا يدري لا يعلم؛ ومن العادات التي انتشرت أعياد الميلاد والاحتفال برأس السنة، وهذا بين والناظر فيحال شباب الأمة يجد هذا رائج فيما بينهم في شكلهم ولباسهم.

العولمة تقوم بنشْر فكر الإلحاد والزندقة بين الشعوب الذين لا يدينون بدين، ولا يقرون بأي عقيدة نزلت من السماء، فهذا لا يمنعهم من تعلم السحر والشعوذة ونشره بكل طريقة تؤدي إلى زعزعة العقيدة الإسلامية.(١)

تعمل العولمة على تهميش كل ما هو قائم على الإسلام أو تدميره وابعاده عن المسائل التشريعية والقضاء على الحكم الإسلامي، ففي التربية تحاول أن تفرض كل ماهو موجود على البلاد الإسلامية، تسلخهم من قيمهم وأخلاقهم المبنية على الكتاب والسنة، وفتح الباب أمام الأنظمة الغربية وقوانينها وقيمها التي أخذتها من عدة فلسفات.

أشغلت العولمة المسلمين بجعل مواسم الطاعات مواسم استهلاكية مثل شهر رمضان بدل من أن يكون شهر الصوم والعبادة والقرآن، جعله شهرا يهتم فيه بالطعام والشراب والملذات وكأن الصائم لا يأكل إلا في رمضان ويقومون بنشر المسلسلات والأفلام الخليعة لشغل المسلمين عن عبادتهم.(٢)

دعمت الأمور التي تثير الشكوك حول المرأة فمثلا نشرت أن الإسلام يظلم المرأة، ودعت المرأة إلى التحرر من كل ما فيه خير لمصلحتها لتنسلخ عن قيمها وأخلاقها ومبادئها التي دعا الإسلام إليها.(٣)

أثر العولمة في النواحي الاقتصادية

قامت العولمة بالسيطرة على أموال المسلمين واستثمارها في البلاد الغربية، لأن البلاد العربية كثرت فيها الحروب التي أدت إلى نشر الفوضى السياسية والاقتصادية مما جعل المسلمون يتبعون للغرب، وهذا أدى إلى تحكم الغرب في ثرواتهم حسب الأنظمة والقوانين الغربية مما جعل الديون تتكاثر نتيجة لتصب في مصلحة الأنظمة الغربية.(٤)

أدت العولمة على بسط أمريكا للتحكم في اقتصاد العالم من وقضت على قوة الدول لتكون السُلطة وقوة الدولة الوطنية لها في الاقتصاد؛ فأنشأت صندوق النقد الدولي ليكون سيفا مسلطا على

---

(١) د.عبد القادر صوفي،آثار العولمة على عقيدة الشباب،ص:٢٩

(٢) ثقافة الداعية في عصر العولمة إعداد شكري مانلين الناشر كلية الدعوة الإسلامية ماليزيا ،ص:٧

(٣) د. بركات مُحَّد مراد،ظاهرة العولمة، ص:١٤٤

(٤) جلال أمين،العولمة،ص:١٥٦

الدول الإسلامية لتتحكم فيه من خلال إغراقه في القروض التي تعطى لهذه الدول بشروط واملاءات أمريكية تجعل هذه الدول تحت رحمتها، ثم تصبح هذه الدول خاضعة لسيطرتها وبهذا تتحكم شراتها بالسوق الدولي[١] فتكون ثروة العالم كله في يد عصابة قليلة تتحكم في هذا العالم.

وهذا يؤدي إلى رفع سعر الأطعمة في البلاد الإسلامية؛ لان الذي يتحكم في السوق هم عصابة يقومون بدعم لسلع الغذائية في الدول الإسلامية وفجأة تقوم أمريكا بإلغاء هذا الدعم، وتحتكر السوق وتصبح المنافسة وغير متساوية بين الدول الكبرى، لأنها وضعت قوانين تتحكم بالجودة العالمية حسب الاتفاقات الدولية بين الدول التجارية والصناعيَّة.

وهذا يؤدي إلى تدمير السلع المحلية حين تكون السلع الخدماتية المستوردة أكثر جودة وأقل تكلفة بينما المنتج المحلي لا يستطيع المنافسة في السوق الدولي ،فهذا يعمل على انخفاض سعر البيع عن سعر تكلفة الإنتاج، وهذا يؤدى إلى ترك المنتج المحلي والاعتماد على ما يستورد فتغلق المنشأت وتكثر البطالة في الدول الإسلامية.[٢]

أثر العولمة في النواحي السياسية

لقد استطاعت العولمة أن تجعل للدول الغربية السيطرة على الحكومات الإسلامية من خلال فرض ما تريد أن تمله على الشعوب الإسلامية عندما يكون لها السيطرة على الحكم وجعله خادماً لخدمة لمصالح الدول الكبرى وعلى رأسها أمريكا، والحركات الصِّهْيَوْنِيَّة التي تتحكم في سياس أمريكا نفسها، ويكون ذلك من خلال اهمال مصالح الدول الاخرى على حساب الشعوب الإسلامية وثرواتها القومية والثقافية والوطنية واعتقادها الدينية.[٣]

لا يعترف نظام العولمة على بالدولة أو الوطن أو الأمة، فهو لا ينظر للإنسان إلا أنه انسان فيقوم بازالة الحدود أمامه، واعطاء الحرية للإعلام العالمي، وانشاء الشركات المتعددة الجنسيات، فأي شيء يعيق الثقافة الرأسمالية المادية والغزْو الفكري، الذي يقصد به تفكيك الأمة وجعلها شذر مذر من خلال إثارة الأمور الطائفية، وفتح الحروب ونشر الفتَن في البلدة الواحدة ومثال ذلك السودان.[٤]

---

(١) عبدالكريم بكار،العولمة،ص:٣٢

(٢) عبدالكريم بكار،العولمة،ص:٣٧

(٣) رضا عبد الواجد أمين،الإعلام و العولمة،ص:٩٦

(٤) أقنعة العولمة السبعة،ص:١٩٢

فالعولمة تحاول أن تجزء المجزئ داخل البلاد الإسلامية والبلاد العربية ، حتى لا يتفرغوا لقتالهم ولكن اشغالهم بأنفسهم وذلك من خلال نشر ثقافة العرقيات وينسوا أنهم أمة واحدة، وهذا ما يراه المسلم الآن واضح نصب عينه وليس سوريا والعراق واليمن وفلسطين ببعيد.

أثر العولمة في الجوانب الاجتماعية

لقد أثرت العولمة على الجانب الاجتماعي في المجتمع الإسلامي وذلك من خلال نشر الثقافة الاستهلاكية –لأنّ العولمة ترفع من شأن الاستهلاك فلم تضع له ضابط ولا رادع، وبعدها قامت باتهام العادات والتقاليد في المجتمع الإسلامي، وذلك من خلال جعل المسلم بعيدا عن قضاياه المهمة، فيتسلل الضعف انفسي لديه، فيصبح شاكاًبكل ما يؤمن به ويريد أن يغير قناعاته الدينية ، وطمس الهوية الثقافية.

جعل العنف طريقة حياة حيث ينظر لها المسلم على أنها أمر طبيعي اعتيادي ، وهذا يؤدي إلى نشر الأخلاق السيئة في المجتمع الإسلامي ،وشغل الشباب المسلم بأمور لا تهمه حتى يضيع وقته في أمور لا تستحق مثل شغله في شبكات التواصل الاجتماعي والمنصات الاعلامية والدعايات للبضائع الأجنبية، وهي مخلوطة بالثقافة الجنسية الغربية التي لا تحترم حياء المسلم كرامته.[١]

ومن مخاطرها أيضا الدعوة إلى حرية الإنسان المطلقة الغير منضبطة فتجعله متَحَرر من كل قيود الأخلاق والدِّين ، حتى يصل إلى مرحلة العدمية، فيصبح لا مفر له مما تعرضه الشركات العالمية الكبرى فيكون بذلك استغل أسوأ استغلال.[٢]

تكريس النزعة الأنانية لدى الفرد، وتعميق مفهوم الحرية الشخصية في العلاقة الاجتماعية، وفي علاقة الرجل بالمرأة، وهذا بدوره يؤدي إلى التساهل مع الميول والرغبات الجنسية، وتمرد الإنسان على النظم والأحكام الشرعية التي تنظم وتضبط علاقة الرجل بالمرأة، وهذا بدوره يؤدي إلى انتشار الإباحية والرذائل، والتحلل الخلقي، وخدش الحياء والكرامة والفطرة الإنسانية.[٣]

---

(١) عباس أبو شامة ، ومُحَمَّد أمين البشري،العنف الأسري في ظل العولمة، جامعة نايف العربية للعلوم الأمنية، الرياض، ص:١١١

(٢) أ.د.أحمد علي الحاج مُحَمَّد ،العولمة والتربية آفاق مستقبلية،ص:١١٨-١٢٠

(٣) عمر عبيد حسنه،العولمة فرص وتحديات،ص:١٤٨

العولمة لا تنظر للروحانيات لأنها مادية خاصة فتهمش الشعور الإنساني والعلاقات الاجتماعية التي تنادي بالتعاطُف والاهتمام بمصالح العامة فيكون الشح والبخل عندها فضيلة، وأن يصل الإنسان إلى الأهداف بأية طريقة، دون أدنى النظر في القيم المنتشرة والمتربي عليها المجتمع .

فوسائل العولمة تتحرك وتحيط بالعالم في كل ثانية، وتدخل بيوت المسلمين فيكل مكان وهم لايشعرون، وفتغير شخصياتهم وذلك من خلال نشر برامجها الشهوانية التي تجمل للمسلم الجسد فتوقعه في عبادته، ، وفلا تدع مجال للقيم المبنية على فطرة سليمة، فتصبح متناقضة ومخالفة للنظام الإسلامي القائم على الألفة والاجتماع والأخلاق النبيلة، التي أرادها الإسلام أن تكون وسيلة لبناء مجتمع خالي من الأقذار ، يؤمن بربه ويتحلى بالفضائل ويعف نفسه عن الرذائل لذلك قال الرئيس بوش –الابن– في خطابه عن وضع الاتحاد اليهودي المسيحي في ٢٩ يناير عام ٢٠٠٢م: "ومن الآن فصاعدًا يحق للعالم: تناول الخمر والتدخين، وممارسة الجنس السوي أو الشذوذ الجنسي، بما في ذلك سفاح القربى واللواط، والخيانة الزوجية، والسلب، والقتل، وقيادة السيارات بسرعة جنونية، ومشاهدة الأفلام والأشرطة الخلاعية داخل فنادقهم أو غرف نومهم."(١)

فيجب علينا كمسلمين أن نحذر من هذه المخاطر التي يجب على كل مسلم في موقعه ومكانه أن يعرفها ويعمل عل ايضاحها للناس ويحذر همنها؛ حتى تأخذنا ، أو نسير معها ونحن لا ندري.

الخاتمة

هذه الجولة في عالم العولمة فإنها أمر مقدر على هذه الأمة إذا استسلمت لذلك، وعلى هذا فالعولمة ليست حتمية ولا قدرية؛ بل هي التي تخالف سنن الله الكونية القدرية والدينية الشرعية.

فالعولمة خالفت سنة الكون التي خلقها الله ﷻوهذا بين من خلال أنها إلزام وفرض للجميع أن يكون على فكر واحد وثقافة واحدة؛ والله ﷻبين أن اختلاف الناس في دينهم وثقافتهم وارد فقال: ﴿وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ إِلَّا مَنْ رَحِمَ رَبُّكَ وَلِذَلِكَ خَلَقَهُمْ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ﴾(٢)

فالأزمة الحقيقية انعدام الوعي في الأمة الإسلامية بذواتها فقد الثقة بقدراتها على الفعل.فالعولمة ليس لها مستقبل تبني عليه الهيمنة الغرب وخاصة الولايات المتحدة الأمريكية فهي لن تستمر كثيرا لأنها

(١) خطاب الرئيس الامريكي" جورج دبليو بوش" القى امام الكونجرس عن [حال الاتحاد اليهودي المسيحي] بتاريخ ٢٠٠٢/١/٢٩

(٢) سورة هود: ١١٨،١١٩

خالفت الفطرة الإنسانية التي ترفض الإلزامات الإملاءات، وهذا جعل العولمة كثقافة منبوذة وتزداد قوتها وشراستها يومًا بعد يوم، هذا يؤدي إلى كثرة الظلم والبغي والابتزاز ولأنها محاولة للسيطرة على حقوق الفقراء من قبل الأقوياء الذين يسيرون العولمة بسبب طبيعة الإنسان عند ما يملك القوة ولا ينضبط بالدين ولا يجد مقاومة مكافئة فإنه حينئذٍ يكون: "ظلومًا جهولاً".

❁ ❁ ❁

موقف الشريعة الإسلامية من التوقيع الإلكتروني فى المعاملات التجارية المعاصرة

Shari'ah Appraisal of Electronic Signature in Contemporary Commercial Transactions

محمد انس رضوان *

ABSTRACT

Electronic Signature is a modern kind of signature and authentication which has been established as an alternative to traditional signature. Electronic signature has been established and used in contemporary commercial transactions under different laws in different jurisdictions. Despite the wide utilization of electronic signature, various issues including Shari'ah perspective on electronic signature, its legitimacy, policy guidelines etc have not been dealt yet. These issues have great impact on electronic signature practice especially in contemporary commercial transactions. This article aims to explore the fundamental concerns about electronic signature in contemporary commercial transactions in the light of the Quran and the Sunnah to fill the gaps. This work will try to establish the usage of electronic signature, its functional equivalency with the traditional signature, its legitimacy and its application in the eye of Islamic law.

Keywords:

* الأستا ذ المساعد، كلية الشريعة والقانون، الجامعة الاسلامية العالمية، اسلام اباد، باكستان

الحمد لله حمدا يليق بشأنه والصلاة والسلام على الحبيب المصطفى و صحابته أجمعين، وبعد.

ان الدين الاسلامى هو أول من دعا إلى العدل ودفع الظلم، فأقام منهجا شاملا لأداء الحقوق لأصحابها متقنا لأصحاب الحقوق وكان هذا لدرء الفساد ومنع الفوضى في المجتمع الإسلامي حيث إن المال بأنواعه هو السبب الرئيس في إشعال نيران الخصومات و المنازعات و لذلك جعل الشريعة الحفاظ عليه من أهم المقاصد الاسلامية الخمسة.

ولقد أصبحت غالبية الإلتزامات والعقود والمعاملات تقوم بالوسائل الإلكترونية تبعا لما توفره الانترنت كوسيلة سهلة فعالة ومتوافرة للعموم وتتيح الحصول على المعلومات وحفظها وتبادلها من دون أن تعترضها الحدود الجغرافية كما أصبحت الإنترنت من أهم وأبرز الوسائل التي تستخدم في ترويج السلع والخدمات وتبادل العروض وإبرام الاتفاقات والعقود والوفاء بالالتزامات خصوصا في مجال التجارة العالمية التي باتت تعرف بالتجارة الإلكترونية وتعتمد بالدرجة الأولى على الإسناد الإلكترونية.

ولقد احتاج ميدان التحقيق و البحث العلمي أن يدخل إلى ميدان التوثيق المدني و التجاري حيث إن وسائل التوثيق السابقة لم تعد تخدم القصد و الغرض في العصر الحديث فضلا عن أن تكون كافية لإحقاق الحقوق المالية وغيرها.

من هنا توجه المحققون إلى اختراع وسائل التوثيق الحديثة ذات الأشكال الجديدة فتطورت من الشكل القديم الفيزيائي إلى شكل آخر افتراضي غير ملموس. كما أن الشرائع الجديدة بذلت جهودها الجبارة في سبيل فصل الكتابة عن الدعامة التي يكتب عليها وبالتالي تم الاعتراف بالكتابة و التوقيع في الشكل الالكتروني الحديث.

ومسايرة لهذا التقدم والانتفاع منه ظهرت اتفاقيات ذات شأن في هذا الصدد. مثل اتفاقية نيويورك الخاصة بالتقادم في البيوع الدولية للبضائع لعام ١٩٧٢م، ففي البند التاسع منها تعرضت الإتفاقية للكتابة الحديثة ومفهومها بجميع صورها وفي الثالث عشر من ديسمبر عام ١٩٩٩ م أصدر البرلمان الأوروبي قانونا حول التوقيع الالكتروني وألزم الأعضاء على العمل به قبل ١٩- ٧- ٢٠٠٠م ثم أتبعه قانون آخر رقم(٢٠٠٠ -٣١) في ٨ من يونيو عام ٢٠٠٠ م. والذي تحتوي مادته التاسعة على أهمية اعتراف الأعضاء بامكانية إجراء العقود و المعاملات بواسطة التقنيات الإلكترونية الحديثة ، وناشد الأعضاء بإبعاد جميع أنواع الموانع في سبيل قبول هذه العقود و المعاملات.

ونظرا لهذا التطور السريع في هذا الميدان اقتضت الضرورة إلى وجود حكم شرعي واضح في هذا الصدد فكان من اللازم حينها أن يجرى بحث تحقيقي فقهي متكامل لدراسة هذا الأمر من جميع الجوانب.

إنه من المؤكد أن الشريعة المحمدية ما غفلت عن طرف من أطراف الحياة البشرية إلا وأدلت بحكمها ودليلها في ذلك الجانب بل وبينت كيفية التعامل مع تلك المشاكل والمواجهات. فإن الشريعة نزلت كاملت متكاملة حيث قال الله جل في علاه: ﴿مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ ﴾.(١) وقال أيضا: ﴿ الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾.(٢)

إن المحور الذي تدور حوله هذ البحث هو التوقيع الإلكتروني الحديث ومايتعلق به من أسئلة واستفسارات. مثل تعيين حدود تعريف مصطلح "التوقيع الإلكتروني" وبيان شروطه ،أنواعه ووظائفه وأثره في الواقع. وخصوصا البحث عن وجهة نظر الشريعة المحمدية تجاه التوقيع الإلكتروني وتطبيقاته في حياتنا التجارية المعاصرة مع بيان مبادئه وأهدافه. وخلال التنقيب عن تلك الحقائق في بحر الشريعة الزخار نذكر بعض التقنيات الدولية مع إلقاء نظرة تنقيدية للمقارنة بينها حسبما يقتضي الحال.

وغني عن البيان أن هذ الموضوع جديد على الشريعة ولم يتطرق له الفقه القديم، لذالك شأنه كشأن مسائل الجدد التي لم نجد فيها كتب او بحوث كثيرة التي تبين جوانبها وتوضح غوامضها وتجعل المسلم على بينة من امره فيما يأتي ويذر من المعاملات التجارية المعاصرة وخاصة العقود الالكترونية والتو قيع الالكتروني ومتعلقاته التي تذداد حاجاتنا اليه في حياتنا التجارية المعاصرة يوما بعد يوم، ولا شك أن هذا الموضوع لم تلم قبل ذلك فهو يتطلب دراسة شرعيةتأصيلية مستنبطة من القرآن والسنة والقواعد العامة في ضوء مقاصد الشرعية.

بداية سأتعرض في هذا المبحث إلى الخلفية التاريخية للتوقيع الإلكتروني باختصار ثم سأبين مفهوم التوقيع الإلكتروني وفي الأخير أذكر الشروط الأساسية للتوقيع الإلكتروني وسيكون هذا في ثلاثة مطالب.

المطلب الأول:ظهور التوقيع وتطوره عبر الزمن

أهمية التوقيع:من المعلوم أنه لا يمكن أن تسمى الورقة مستندا قانونيا إلا إذا ازدانت بتوقيع فهو شرط الثبوت والتوثيق وهدفه الحجية والإثبات في العالم بأسره وعدم وجود هذا التوقيع يفقد الورقة قيمتها القانونية فلا هي بحجة عندها ولادليل لأن التوقيع هو الذي يمنح الورقة قيمتها القانونية وينسبها إلى صاحبها وإن كتبت بخط غيره.(٣)

---

(١) سورة الأنعام:٣٨

(٢) سورة المائدة،: ٣

(٣) د.نوري مُحَمَّد خاطر،وظائف التوقيع في القانون الخاص، كلية الدراسات الفقهية والقانون، الأردن، أكتوبر ٢٠٠٥م.ص٢١

ظهور التوقيع وتطوره: إن تاريخ التوقيع يعود إلى عصر البابليين، فلقد كان الملك دابوس يستخدم خاتما يلبسه في إصبعه كختم له. ومن بعدهم استخدمه الفراعنة ، فكان هامان – وزير فرعون — يختم الخطابات الملكية والأوامر بختم فرعون. وكان للرومان حظ من ذلك فغدا لكل فرد منهم ختم خاص به له قوته وسلطته. ثم تناقلت هذه الظاهرة إلى الفرنسيين فاتخذ ملك فرنسا ختما في شكل صليب لتوثيق مستنداته الرسمية. أما العامة من الناس فقد تركوا استخدام الصليب كختم لهم. ثم استبدل الختم المخطط بالإمضاء الخطي في القرن العشرين وشاع ذلك بين الناس في نهاية هذا القرن أما المسلمون فما استخدموا توقيعا غير الختم وتداوله الخلفاء والامراء في خطاباتهم الملكية والرسمية. وفي العصر العباسي ظهر ديوان خاص بالختم يتولى أمره وزير مختصٌ.

أما في عهد الرسول عليه السلام فبدأ باستخدام الختم في رسائله صلوات الله عليه إلى الملوك والامراء عندما علم أن العجم لا يقبلون الكتاب غير مختوم، فاتخذ حينها خاتما منقوش عليه "مُحَمَّد رسول الله" في ثلاثة أسطر أفقية. ثم حظر الرسول ﷺ الصحابة من تقليده.ولقد توارثه الخلفاء من بعده غير عثمان ففقده وصنع غيره.(١)

وضالتنا في كل هذا البسط ان التوقيع دام في صورة ختم إلى القرن الخامس عشر و مع إشراقة القرن السادس عشر تحول إلى الإمضاء الكتابي للإلتزام بقانون ما. ثم في نهاية القرن العشرين تحول التوقيع مرة أخرى إلى شكله الحديث إثر التطور التكنولوجي فظهر اصطلاح جديد يشمل جميع الوسائل التوثيقية والإثباتية الحديثة مثل إدخال الأرقام أو الرموز السرية أو الحروف المشفرة في الحواسيب الآلية أو الشنكبوتية وهو " التوقيع الإلكتروني" ولما كان التوقيع هو المكون الأساسي في المستندات الخاصة والعامة حتى يكون بها وزنا قانونيا و تقوم حجة عند الخصام فيجب حينها أن نعلم أن التوقيع يقوم على ركيزتين مهمتين. أولاهما: مادية في صورة إمضاء أو ختم أو بصمة، وثانيهما: معنوية وهي معتقد الموافقة من قبل الطرفين حسب ما ينصه المستند من شروط وضوابط والموافقة القانونية على التصرف.(٢)

إن هذا المفهوم هو مفهوم التوقيع التقليدي وعليه فإنه من المتعذر أن يفرق بين الركيزتين السابقتين للتوقيع وحينها لن يكون التوقيع إلا عبارة عن علمات متميزة من طرف شخص محدد على مستند ما للتعبير عن موافقته لجميع محتويات المستند" وطبقا لهذا المفهوم فإنه يلزم ان يكون محل التوقيع التقيدي فيزيائيا ملموسا بغض النظر عن ماهيته.

---

(١) د. نوري مُحَمَّد خاطر، وظائف التوقيع في القانون الخاص، المرجع السابق. ص: ٢٨

(٢) "المحامي حسين المؤمن، نظرية الإثبات، مكتبة النهضة، بيروت،بغداد،١٩٧٥"م، ٢٩٨/٣

ولما أن العرف جرى بنقل المعلومات في أوراق فاقتضى أن يكون تصديق و توثيق تلك المعلومات على نفس الأوراق الناقلة للمعلومات، وذلك هو التوقيع التقليدي.[١]

المطلب الثاني:مفهوم التوقيع الإلكتروني حسب المفاهيم الدولية

مفهوم التوقيع: يقصد بالتوقيع ما يضعه صاحب الكتابة في نهاية كتابه من علامة متميزة و مختصة به التي تدل على إقراره و تدل كذلك على صحة المعلومات الواردة في المسند و الملف، وعادة يكون توقيع شخص بكتابة اسمه كاملا أو جزأ منه أو اشارة مخصوصة لصاحبه بخطه و هذه أكثرها شيوعا وقد يكون التوقيع في شكل الختم الذي يدل على اقرار المرء بما كتب في الوثيقة، ولكن مع التقدم التكنولوجي والحضاري اتخذ التوقيع أشكالاً عديدة باستخدام طرق جديدة له، على سبيل المثال تارة يكون بالإمضاء بخط اليد أو بوضع علامة أو رقم سري وغير ذلك من طرق متنوعة له ومنه المرتبطة بشبكة الانترنت، وقد يكون ببصمة الإصبع التي هي من أوضح العلامة المميزة للبشر بأفرادهم[٢]. اصطلح على تسميته كذلك بالتوقيع الإلكتروني وهو يدل دلالة واضحة و صريحة عن ارادة صاحبه في قبول الالتزام بما جاء فيه، واختصارا لا يختلف التوقيع الإلكتروني عن التوقيع العادي اليدوي الا باعتبار أسلوبه وادواته المستخدمة له، ولا شك أن مثل هذه التواقيع وما يشابها في وظائفها مشروعة وتدل على صدق الوثيقة وصحة العمل بما جاء فيها.

ومن هنا نعلم أنه ليس المقصود بالتوقيع الإشارة والعلامة الخطية التقليدية التي يتخذها الشخص علامة لنفسه تميزه عن غيره فحسب ، وإنما يأخذ معنى أوسع ، ليشمل كل إشارة أو رمز تميز صاحبها عن غيره سواء كانت هذه العلامة خطية باليد، أو كانت بالوسائل الإلكترونية أو الميكانيكية لتشتمل التثقيب والرمز الإلكتروني والأرقام الإلكترونية أو غير ذلك مما لا يمكن أن يشترك فيه اثنان ولا يمكن تقليده إلا بمشقة وصعوبة.

التوقيع حسب القوانين الدولية

قانون الأمم المتحدة: ثم أن المادة (١/٢) من قانون الأمم المتحدة عرفت التوقيع الإلكتروني على أنه:

---

(١) "د.آلاء يعقوب يوسف، التوقيع الرقمي تطور في المفهوم والأحكام، بحث منشور في مجلة كلية الحقوق جامعة النهرين، مجلة علمية محكمة تصدرها كلية الحقوق – جامعة النهرين"، العدد (١٢)، المجلد (٧)، ٢٠٠٤م، ص:٩٨

(٢) د.عباس العبودي، التعاقد عن طريق وسائل الاتصال الفوري وحجيتها في الإثبات المدني،دار الثقافة، عمان،المملكة الأردنية الهاشمية ١٩٩٧م،ص:٢٣٦

"بيانات في شكل إلكتروني مدرجة في رسالة بيانات، أو مضافة إليها، أو مرتبطة بها منطقياً، يجوز أن تستخدم لتعيين هوية الموقع بالنسبة إلى رسالة البيانات، ولبيان موافقة الموقع على المعلومات الواردة في رسالة البيانات"(١)

اضافة إلى ذلك قامت اللجان المختصة بشأن قانون التجارة الدولية لعام ١٩٩٨م التابعة للأمم المتحدة بوضع مشروع قواعد موحدة في التوقيع و نصت المادة الأولى منه بتعريفه كما يلي:" رمز أو إجراء يستعمل من قبل شخص أو بالنيابة عنه لتعيين هويته والإشارة إلى موافقته على المعلومات التي رضي بها بواسطة هذا التوقيع "(٢)

قانون دولة الإمارات العربية المتحدة:أما الدستور الإماراتي وبالخصوص قانون دبي الرقم الثاني لسنة ٢٠٠٢م فلقد قسم التوقيع الإلكتروني إلى نوعين اثنين رئيسيين وهما التوقيع الإلكتروني والتوقيع الإلكتروني المحمي.

فتعريف الأول هو كما يلي:"توقيع مكون من حروف أو أرقام أو رموز أو صوت أو نظام معالجة ذي شكل إلكتروني أو مرتبطاً منطقياً برسالة الكترونية ومن بينه توثيق أو اعتماد تلك الرسالة".

أما الثاني المحمي فهو التوقيع الإلكتروني القائم على شروط المادة رقم (٢٠) من القانون السابق ونصه كما يلي: "يعامل التوقيع على أنه توقيع إلكتروني محمي إذا كان من الممكن التحقق من خلال تطبيق إجراءات توثيق محكمة، منصوص عليها في هذا القانون ومتفق عليها بين الطرفين،(٣)"

وبالنظر إلى هذه التعريفات للتوقيع الإلكتروني فإنه يتضح أمامنا أن التوقيع الإلكتروني يجب أن يحتوي على عدد من الصفات اللازمة وهي كالتالي:

---

(١) "اعتمد هذا القانون بقرار الجمعية العامة للأمم المتحدة ٨٠/٥٦ بناءاً على تقرير اللجنة السادسة A/56/5888 بالجلسة العامة بتاريخ ١٢ ديسمبر ٢٠٠١م". وراجع نص هذا القانون على الموقع الإلكتروني:

http://www.uncim.org.phdf/arabic/text/electrom/mel-elecsig-a.pdf

(2)"United Nation Commission on international Trade law, working Group on Electronic Commerce- thirty second Vienna. 1930d January 1998 – uniform rules on electronic signatures".

ونص هذا الفقرة (٩) من هذه المادة باللغة الإنجليزية.

"Signature" means symbol used, or any security procedure adopted by (on behalf of) a person with"

(٣) "د.أسامة الروبي، حجية التوقيع الإلكتروني في الإثبات ، المؤتمر العلمي السابع عشر، مؤتمر المعاملات الإلكترونية (التجارة الإلكترونية، الحكومة الإلكترونية)، كلية القانون، جامعة الإمارات العربية المتحدة"، في الفترة من ١٩ – ٢٠ مايو ٢٠٠٩م، ص: ٥٠٨

١-يمكن استخدام هذا التوقيع في انفراد.

٢-أن تكون هوية الشخص ممكنة الإثبات من خلاله.

٣-وأن يكون تحت القدرة التامة لصاحبه عند إنشاء واستعمال التوقيع.

٤-أن يكون له صلة برسالة إلكترونية أو أي وسيلة أخرى معتمدة يمكن الإعتماد عليها.

القانون الأوروبي(١): فهو لايختلف كثيرا عن قانون دولة الإمارات العربية المتحدة الا في نقاط بسيطة، لذلك نحذفه بخشية الاطالة

القانون الغربي:الكثير من الحكومات الغربية أدخلت التوقيع الإلكترونية ضمن دستورها كجزء من القوانين. مثل القانون الانجليزي: فقد أصبحت للتوقيع الإلكتروني نفس القيمة التي كانت للتوقيع اليدوي في القانون الإنجليزي منذ ٢٥- ٧-٢٠٠٠ ، ولقد وضع المشرع الأمريكي قانون التوقيع الإلكتروني في التجارة العالمية والوطنية لسنة ٢٠٠٠م و كان محتواه أنه ينص على إضافة القوة التوثيقية الخاصة بالتوقيع اليدوي للتوقيع الإلكتروني. و عندها جرّ ذلك الأمر بولايات المتحدة الأمريكية إلى تقنين القوانين التي تحد في الإثبات من قيود المحررات الموقعة الإلكترونية.

ولقد أصدر البرلمان الكندي القانون رقم ٦١ لعام ٢٠٠٠م في حق التجارة الإلكترونية وفي المادة (١/١١)منه تصريحٌ بأن التوقيع الإلكتروني حجة في التوثيق (٢)

ويرى الباحث أن جميع القوانين السابقة تشير إلى مفهوم واحد وهو المساواة بين التوقيع الإلكتروني والتوقيع اليدوي في التوثيق والإثبات.

المطلب الثاني:الشروط الأساسية للتوقيع إن ما يعطي التوقيع من أهمية في إثبات الحقوق ليس إلا أن له دورا هاما في سبيل الإثبات حيث يمكن بواسطته معرفة الموقع و إرادته حول محتوى السند القانوني وتحقيقا لتلك المقاصد فإنه يلزم وجود هذه الشروط في التوقيع:

الشرط الأول: أن يكون دالاً على الموقع بكل وضوح، حتى تثبت حجية التوقيع ويقوم كدليل لا بدّ أن يكون دالا على الموقّع بشكل واضح ومميّز (٣)وقد يكون التوقيع في شكل اسم الموقّع لأنه الأوضح و

(1)"Electronic Signature" means data in electronic from which are attached to or logically associated which other electronic data and which as a method of authentication".

(٢) الموقع الإلكتروني:

ttp://www.bmck.Com/ecommerce/whatsnew.wsignaure.june.des.2000.htm

(٣) د. حسن عبد الباسط جميعي، مصدر سابق، ص: ٢٨

الأكثر دلالة على صاحبه و لكن مع ذلك فقد يكون التوقيع إمضاءً أو ختماً أو بصمةً.[١] والتوقيع من أحد صور الكتابة ولذلك فشرطه شروط الكتابة نفسها من حيث معرفته بشكل مباشر أو غير مباشرأو عن الطريق الآلي.

الشرط الثاني:أن يكون التوقيع قابلا للقراءة وقابلا للعودة إليه، إن ما يهمنا في هذا الموضع هو أن التوقيع مطلقا والكتابي منه خاصة يجب أن يكون قابلا للقراءة و يكون من صفاته صفة الاستمرارية وإنه من المعلوم أن التوقيع الإلكتروني كونه شكل من أشكال الكتابة الإلكترونية، يمتاز بجميع صفات التوقيع الخطي التقليدي مثل القراءة والاستمرارية والاثبات،و بذلك يمكن الحكم على وجود المساواة بين نوعي التوقيع.

الشرط الثالث:الالتزام بمحل التوقيع في المستند، ومعنى ذلك أن يكون موضع التوقيع في الورقة القانونية في الوجه الأمامي منها للدلالة على إرادة الموقّع بأنه موافق على محتوى المستند القانوني وبذلك فإن الموضع الأفضل للتوقيع هو الجزء الأخير من الورقة القانونية غير أنه يجوز أن يغير مكان التوقيع من الورقة.[٢]

الشرط الرابع: كون التوقيع بيّنًا و واضحًا، لقد اعتاد الناس على أن يميزوا التوقيع عن مضمون السند ولذلك عادة ما يكون في مؤخرة السند.وكذلك إن النسخة الكربونية من هذا التوقيع يمتلك قوة قانونية مؤثرة فهي حجة.[٣]

ويرى الباحث أن النسخة الكربونية من التوقيع الخطي هي نسخة طبق الأصل من التوقيع الخطي ولها أثرها و لا فرق بينهما. وفي سنة ٢٠٠١ وضعت الامم المتحدة قانون أونسترال في ما يتعلق بالتوقيعات الإلكترونية.واحتوت المادة السادسة منه على أنه: "عندما يشترط القانون وجود توقيع من فرد، يستوفي ذلك الشرط بالنسبة إلى رسالة البيانات إذا استخدم توقيعا إلكترونيا موثوقا بالقدر المناسب للغرض الذي أنشأت أو أبلغت من أجله رسالة البيانات في ضوء كل الظروف بما في ذلك أي اتفاق ذي صلة، كما جاء في الفقرة الثالثة من تلك المادة ذاتها يعتبر التوقيع الإلكتروني موثوقاً لغرض الوفاء بالشرط المشار إليه في الفقرة [١] إذا:

---

(١) "د. محمد المرسي زهرة، الدليل الكتابي وحجية في الإثبات، متوفر القانون والكمبيوتر والانترنت، دار النهضة، العربية، القاهرة، ط١، ٢٠٠٨م، ص: ٨٠٨".

(٢) "د. عباس العبودي، السندات العادية ودورها في الإثبات المدني، الدار العلمية الدولية، ومكتبة دار الثقافة للنشر والتوزيع، ط١، عمان، الأردن، ٢٠٠١م"، ص: ٥٢

(٣) "د. محمد حسام الدين لطفي حجية النسخة الإلكترونية في الإثبات – مجلة الأحكام – المجلد الخامس س ١٩٩٦م، ص: ١٢٧ وما بعدها".

الشرط الخامس:علاقة التوقيع بالموقع، أن تكون لوسيلة إنشاء التوقيع الإلكتروني علاقة خاصة بالموقّع دون غيره في السياق الذي يستخدم فيه هذا التوقيع.

الشرط السادس:السيطرة الكاملة للموقّع، أن تكون وسيلة التوقيع الإلكتروني تحت السيطرة التامة للموقّع فقط دون غيره.(١) والنتيجة التي يعرضها الباحث هنا هي أن التوقيع القانوني هو وسيلة توثيق صحة المعلومات التي تتعلق بالموقّع قانونيا.

المبحث الثاني: أنواع التوقيع الإلكتروني و وظائفه التوقيع الإلكتروني له أنواع عدة منها التوقيع الرمزي أو السري. والبيومتري القائم على خصائص الإنسان الجسدية وسلوكياته والتوقيع الرقمي وهو عبارة عن رموز مشفرة مرتبطة بمفاتيح خاصة. إننا هنا في هذا المبحث سنتحدث عن جميع هذه الأنواع و سنتعرض لوظيفة كل نوع من التوقيع ثم سنأتي ببيان مفصل عن مدى استطاعة التوقيع الإلكتروني على أن يحل محل التوقيع اليدوي التقليدي في صوره و وظائفه، وسيكون هذا المبحث مشتملا على مطلبين اثنين:

المطلب الأول: أنواع التوقيع الإلكتروني

وسيكون هذا في خمسة فروع

١ .التوقيع الرمزي أو السري

٢ .التوقيع بالقلم الإلكتروني

٣ .التوقيع البايوميتري (Biometric signature)

٤ .التوقيع الرقمي (Digital Signature)

٥ .التوقيع الناشيء عن استخدام بعض أزرار لوحة مفاتيح الحاسوب.

الفرع الأول: التوقيع الرمزي الكودي أو السري (P.I.N)

التوقيع الكودي أو السري عبارة عن بعض الحروف أو الأرقام أو كليهما معا تستخدم كوسيلة لتوثيق المعلومات و الملفات و المعاملات الإلكترونية و من خصائصها أنها سرية بين صاحبها والطرف الآخر وتسمى بالإنجليزية (Personal Identification Number) واختصاراً (P.I.N).(٢)

وفي أغلب الأحيان يرتبط هذا النوع من التوقيع مع البطاقات الإلكترونية والممغنطة مثل بطاقات السحب الآلي و بطاقات الدفع الإلكتروني وغير ذلك من البطاقات التي لها ذاكرة داخلية.(١)

---

(١) "د. نبيل مهدي زوين: المحررات الإلكترونية،دراسة مقارنة، ص:٢٩، وراجع نصوص القانون على الموقع الإلكتروني."http:/www.Uncitral.org

(٢) د. حسني عبد الباسط جميعي – إثبات التصرفات القانونية التي يتم إبرامها عن طريق الإنترنت، ص: ٣٤

هناك العديد من أمثال هذه البطاقات التي تمارس وظائفها عمليا مثل بطاقة "فيزا" (visa)، وماستركاد (Master Card)، وأميركان اكسبريس(American Express).

أما عملية أداء أمثال هذه البطاقات لوظيفتها في دفع المال أو أدائه فتمر عبر الخطوات التالية:

١- إمرار البطاقة الإلكترونية المزودة بمعلومات العميل الموثقة إلى جهاز خاص بمعرفة و قراءة تلك المعلومات وبيانات البطاقة.

٢- درج الرمز السري الخاص بصاحب البطاقة (P.I.N)

٣- إكمال عملية سحب أو دفع الأموال بواسطة الضغط على زرالموافقة على الحاسب الألي.

وينصح بالاحتفاظ على الرمز السري (P.I.N) بعيدا عن الآخرين لقدرة الغير على السرقة و انتحال شخصية المالك الأصل.[٢]

ويرى الباحث أن الرأي السابق الناقد لصورة التوقيع في البطاقات الإلكترونية رأي غير مقنع حيث أن هذا النوع من التوقيع يمتاز بمزايا التأمين التي توثق أمانة الأسرار وحفظ الحقوق. أما أن يفقد صاحب البطا قة البطا قة و الرقم السري كليهما معا في نفس الوقت ثم يتحصل عليها شخص واحد في وقت واحد فهذه نادرا ما يحصل و يعود إلى الإهمال المبالغ من قبل الشخص المالك مع أنه يمكنه تجنب السرقة بإلغاء البطاقة بضغط زر على الحاسوب أو اتصال إخطاري إلى الجهات المعينة لذلك.

ولقد قرر القضاء مؤخرا ميثاقية هذا النوع من التوقيع (التوقيع الكودي السري) لكونه متمتعا بوسائل التأمين و احتوائه على شروط الاثبات الموجودة في التوقيع التقليدي.[٣]

---

(١) "ظهرت البطاقات البنكية (Bank card) كوسائل للدفع الإلكتروني في الولايات المتحدة الأمريكية حوالي عام ١٩١٤م عندما أصدرت شركات البترول الأمريكية بطاقات معدنية لعملائها لشراء ما يحتاج من منافذ التوزيع التابعة لها وتسوية هذه المشتريات في نهاية كل مدة محددة، وتطور استخدام هذه البطاقات وانفصلت عن الجهة التي تصدرها بحيث يجوز استخدام البطاقة لشراء احتياجات متنوعة وعلى مستوى جغرافي واسع دون التقيد بمنافذ التوزيع التابعة للجهة المصدرة. ثم انتشرت وسائل الدفع الإلكتروني إلى باقي الدول الأوروبية والعالم. راجع رضوان، مُحَمَّد أنس، الأحكام الشرعية لأنواع البطاقات البنكية، رسالة ماجستير، غير مطبوع، كلية الشريعة والقانون – الجامعة الإسلامية العالمية – ٢٠٠٩م، ص: ١٣٧ و ٢٢٠ وما بعدها."

(٢) د. إبراهيم الدسوقي أبو الليل، توثيق المعاملات الإلكترونية، مؤتمر الأعمال المصرفية بين الشريعة والقانون، كلية الشريعة والقانون، الأمارات العربية المتحدة، ١٠-١٢ مايو، ٢٠٠٣م، ص: ١٨٥

(٣) د. حسن عبد الباسط جميعي – إثبات التصرفات القانونية التي يتم إبرامها عن طريق الانترنت، المرجع السابق، ص: ٣٧

ويرى الباحث أيضا أن هذا النوع من التوقيع لا يصلح لأن يكون توثيقا للدليل الكتابي القانوني لأنه يحتفظ سرا ولايلحق بالمستندات الشبكية فضلا عن أن يكون توثيقا للأوراق القانونية الأخرى. حتى أن البنك في حد ذاته يتوخى الحذر في إثارة هذا النوع عند العقد مع العميل صاحب البطاقة.

الفرع الثاني:التوقيع بالقلم الإلكتروني: مع تطور العلم والتكنوجيا تطور التوقيع البايوميتري.(البصمي) إلى شكل آخر في شكل قلم إلكتروني يكتب على شاشة نوع خاص من الأ جهزة تستخدمها جهات الأمن والمخابرات[١] لتحديد شخصية معينة قد سبق تخزين هويته سابقا في الجهاز وفيه برنامج من نوع خاص له مواصفات خاصة يعمل على قراءة التوقيع على الشاشة وتحليله ثم تعيين شخصية معينة عن طريق معالجة خاصة.[٢]

طريقة عمل التوقيع بالقلم الإلكتروني: يستخدم الشخص قلما من نوع خاص على شاشة في جهاز مخصص و مزود بمواصفا ت خاصة يعمل على معرفة التوقيع وصاحبه.[٣]

ويرى الباحث أن هذه الطريقة من التوقيع الإلكتروني طريقة لا يمكن الوثوق بها قطعا . حيث أنه من المحتمل تماما أن تنسخ صورة التوقيع المكتوب بواسطة القلم الإلكتروني ثم استخدام هذه الصورة استخداما خلافا للقانون على مستندات و معاقدات ورقية و إلكترونية.

الفرع الثالث التوقيع البيومتري (Biometric Signature): هذا التوقيع يتمتع بدرجة كبيرة من الحجية والقدرة على الاثبات. حيث إن أساس هذا التوقيع هو الصفات والخواص الجسدية والفيزيائية والعضوية للإنسان. وقد أجمع المختصون أن كل فرد من البشر يمتاز عن غيره بصفات جسدية وسلوكية مميزة عن غيره. فبذلك يكون حجة و دليلا.[٤]

يرى الباحث أنه رغم ادعاء الشركات المنتجة لأجهزة التعرف (البايومترية) على خصائص الأعضاء البشرية بأنها موثقة ومأمونة ٩٩% إلى ٩٩,٩% إلا أنه يقع التردد والشك في هدا الإدعاء عند ما تظهر حالات احتيال وعدم تعريف الأجهزة المخصصة على البصمة البلا ستيكية المطاطية (Latex

(١) حمود، د. عبد العزيز المرسي، مدى حجية المحرر الإلكتروني في الإثبات،دار النهضة العربية، ٢٠٠٥م، ص: ٣٦

(٢) د. إبراهيم الدسوقي أبو الليل، توثيق العملات الإلكتروني ومسؤولية جهة التوثيق تجاه الغير المتضرر، مؤتمر الأعمال المصرفية الإلكترونية بين الشريعة والقانون المجلد الخامس، مرجع سابق ، ص: ١٨٥٧

(٣) د.إبراهيم الدسوقي أبو الليل،توثيق المعاملات الإلكترونية،مؤتمر الأعمال المصرفية الإلكترونية، المرجع السابق، المجلد الخامس، ص: ١٨٥٩

(٤) حمود، د. عبد العزيز المرسي – مدى حجية المحرر الإلكتروني في الإثبات– المرجع سابق –، ص: ٣٦.

Rubber Fingers) أو عدم قدرةالأجهزة المصنوعة من (Silicon Sensor) على التحقق من وثائق السيليكون من كشفها أو التعرف عليها.[١]

الفرع الرابع : التوقيع الرقمي (Digital Signature):

هو عبارة عن تشفير للتوقيع و محتوى الرسالة الموقعة ذات المضمون الموافق عليه برموز و أرقام معقدة لا تقرأ ولا تفهم[٢] عن طريق أساليب رياضية معقدة وتسمى هذه "الرسالة المشفرة" (Message digest)، ويتم فك هذه الرسالة المشفرة عن طريق النظام السيمبتري (Symmetrical) الذي يعتمد على مفتاح واحد عند المرسل والمستسلم. ولذلك فإن هذا النظام يعتبر غير موثق لعملية الإثبات. وتطويرا لجانب الأمن والتوثيق في هذا النظام ظهر نظام آخرباسم (Asymmetric)، وهو يمتاز عن الأول بأنه يعتمد على مفتاحين، الأول للتشفير و يُسمّى المفتاح الخاص (Private key) والآخر لحل هذا التشفير ويُسمى (Public key)وظهر مصطلح جديد لهذا النظام باسم نظام المفتاح العام.

الفرع الخامس: التوقيع بواسطة كبس أحد أزرار الحاسوب للموافقة على تصرف قانوني معين:

تعقد الصفات على الإنترنت من خلال إرسال رسالة إلى صاحب المعاملة تحتوى على جميع محتويات وبنود العقد وأمامها مربعات القبول (نعم) أو مربعات الرفض (لا) ويتم قبول هذا النوع من التوقيع بمجرد الضغط على زر القبول[٣] و في بعض الأحيان يطالب العميل بالضغط على الزر مرتين لضمان صحة المعاملة وتأكيدها.[٤] أما عن تحقيق هذا التوقيع لغرض الاثبات فإن مجردالضغط على زر (OK) لا يعتبر سببا كافيا لأن يكون دليلا كتابيا. لأن المحررات الإلكترونية تتطلب أن يكون فيها إمكانية استخدام

(١) د. عصام عبيد – التوقيع الإلكتروني – دراسة في المفاهيم والتقنيات والمعايير وراجع الموقع الإلكتروني: http://www.knol.google.com/k/dressam/eibeed/228no0b4xj973/43#.

(٢) د. عصام عبيد – التوقيع الإلكتروني – دراسة في المفاهيم والتقنيات والمعايير وراجع الموقع الإلكتروني: http://www.knol.google.com/k/dressam/eibeed/228no0b4xj973/43#.

(٣) د.حسن عبد الباسط جميعي، إثبات التصرفات القانونية التي يتم إبرامها عن طريق شبكة الانترنت، المرجع السابق، ص: ٣٧

(٤) د.حسن عبد الباسط جميعي، إثبات التصرفات القانونية التي يتم إبرامها عن طريق شبكة الانترنت، المرجع السابق، ص: ٣٨

المفتاح الخاص الذي تمنحه الجهات المصدقة القانونية [١] .يرى الباحث أن طريقة التوقيع هذه طريقة معقولة و تعبير صريح عن إرادة المتعاقدين على شاشة الحاسوب.

المطلب الثاني : وظائف التوقيع الإلكتروني وتحقيقه

الفرع الأول: وظائف التوقيع الإلكتروني

من البداهة أن التوقيع الإلكتروني يؤدي وظائف التوقيع التقليدي و لكن هنالك بعض الأغراض الحديثة التي لا تتم الا بالتوقيع الإلكتروني، وهي :

الوظيفة الأولى: التوثيق من أهداف التوقيع الإكتروني المميزة له قدرته على تعيين هوية وشخصية المتعاقدين في المعاملة.

الوظيفة الثانية: السلامة ، ضمان عدم القدرة على تغيير محتوى نص التحرير القانوني و بالتالي تتحقق متطلبات القانون في التحرير فيكون دليلا كتابيا قانونيا [٢]

الوظيفة الثالثة: السرية ، من مزايا التوقيع الإكتروني السرية التامة للمعلومات الداخلة ضمن نص العقد حيث إن العملية يتم فيها التشفير للمحتوى بطريق لا يُقرأ و لا يُفهم إلا عن طريق صاحب المعاملة و المفتاح العام الخاص بالمعاملة.

الوظيفة الرابعة: عدم الإنكار، و من مزاياه أنه يلزم الموقّع على الانضباط التام بما وقع عليه ولا يفسح له المجال لإنكار توقيعه على التحرير أو المعاملة المنسوبة إليه(Non repudiation) بسبب الربط الوثيق بين المفتاح العام و المفتاح الخاص.[٣]

الوظيفة الخامسة: خدمة التقاط التوقيع (The Signature Capture Service): في حالة استخدام القلم الإكتروني،[٤]يضع الشخص بطاقة خاصة داخل جهاز ماسح خاص فينفتح ملف ذلك الشخص على الشاشة ثم يرسم توقيعه على الشاشة عبر قلم آلي في داخل الشاشة و حينها يقوم الجهاز بتأكيد التوقيع أو إعادة المحاولة، فإذا أكد الشخص رسم التوقيع يقوم الجهاز بقراءة التوقيع و حفظه في شكل

---

(١) د.خالد ممدوح إبراهيم، إبرام العقد الإلكتروني،دراسة مقارنة، دار الفكر الجامعي ٢٠٠٦م، ص: ٢٠١.

(٢) د.بشار طلال مؤمني – مشكلات التعاقد عبر الانترنت – دراسة مقارنة – عالم الكتب الحديثة،الأردن ٢٠٠٤م، ص: ١١٤"راجع الموقع الإلكتروني
http://www.kenanaonline.com/wsk/khaled17/page/77870

(٣) د.حسن عبد الباسط جميعي، إثبات التصرفات القانونية التي يتم إبرامها عن طريق شبكة الانترنت، المرجع السابق، ص: ٣٥

(٤) د.عبد الفتاح بيومي حجازي، التوقيع الإلكتروني ، دار الفكر الجامعي، ٢٠٠٥م،ص: ٤٠٠

رموز مشفرة ثم يضيف إليه باقي البيانات المهمة من معلومات الحساب و أوقات الاستخدام ومرات المحاولة وغير ذالك. وتسمى هذه البيانات المشفرة (Biometric Token) بالشارة البيومترية [١]

الوظيفة السادسة: خدمة التحقق من صحة التوقيع (Service The Signature Verification):

ومهمة هذه الخدمة في الإخطار عن مدى صحة التوقيع أو عدمه ، وتنبنى أساسا عملية هذه الخدمة على إحصائيات لبيانات الشخص المحفوظة في النظام. فتقوم الخدمة بفك الشارة البيومترية (Biometric Token) ومقارنة الإحصائيات المخزنة من قبل ثم ترسل الخدمة تقريرا مفصلا إلى نظام الحساب الآلي والذي بدوره يصدر الحكم على صحة التوقيع او عدمه.[٢]

الفرع الثاني: تحقيق التوقيع الإلكتروني لوظائف التوقيع التقليدي نذكر بأن وظائف التوقيع التقليدي هي التعرف على صاحب التحرير القانوني وتعيين مواصفاته الشخصية إضافة إلى النيابة عن رضاه بمحتوى المستند القانوني، قد ينشأ سؤال في بعض الأذهان بأن التوقيع الإلكتروني غير قادر على أداء المهام الأساسية للتوقيع اليدوي لأنه عبارة عن أشعة كهربائية ليس لها واقع ملموس ثم أنها تجري في واسط إلكتروني لا يستطيع التعرف على الأشخاص بشكل فيزيائي ملموس بخلاف التوقيع اليدوي فإنه يوصل إلى صاحبه عن طريق دراسة فنية و تقنية للتوقيع على يد خبراء ومهرة.

وكون التوقيع الإلكتروني بالصفة السابقة يوقع العقل في تردد فهل يستطيع التوقيع الإلكتروني تحقيق وظائف التوقيع اليدوي أم لا؟ ولكن رغم كل ذالك فإننا نقربأن التوقيع الإلكتروني لا يفرق عن اليدوي الا في الوسيلة والوسط الذي يتم فيه ممارسته فإنه يؤدي جميع وظائف التوقيع اليدوي من غير شك ولاريب.

الآن اريد أن أقيم الموازنه بين انواع التوقيع، التوقيع الإلكتروني والتوقيع التقليدي باختصار

النقطة الأولى: تعيين الشخصية الخاصة، من أهم وظائف التوقيع تعيين شخصية الموقع و تمييزه عن غيره و هي بارزة تماما في التوقيع اليدوي. فإنه من البداهة أن إجراءات التوقيع الإلكتروني عن طريق الأرقام

---

(١) د.إبراهيم الدسوقي أبو الليل، توثيق المعاملات الإلكتروني مؤتمر المعاملات المصرفية الإلكترونية، المرجع السابق، المجلد الخامس، ص: ١٨٥٨.

(٢) د.حسن عبد الباسط جميعي،إثبات التصرفات القانونية التي يتم إبرامها عن طريق الانترنت، المرجع السابق،ص:٤٢

السرية و الرموز المشفرة باستخدام البطاقات والمفاتيح المزدوجة تعمل على تحقيق الثقة والأمن بدرجة تفوق ثقة التوقيع اليدوي [١].

النقطةالثانية: تحقيق رضا الموقع: "هو ارتباط الإيجاب الصادر من أحد المتعاقدين بقبول الآخر وتوافقهما على وجه يثبت أثره في المعقود عليه ويترتب عليه التزام كل منهما بما وجب عليه للآخر."[٢]

و من المعلوم أن للعقد أركانا عدة و هي: المحل و السبب والرضا فالركنان الأولان طبيعة تطبيق القواعد عليهما مماثلة تماما كما هي موجودة في العقود التقليدية الورقية الملموسة. أما العقود التي عقدها على الإنترنت فإنها لها شكل آخر. فهي لا تجرى علي أوراق فيزيائية. و خصوصا إذا كانت عقود الإنترنت غير مقيدة بشكل خاص قانونيا.

فالمحور التي تدور حوله العقد الالكتروني هو تراضي الطرفين و غالبا مايكون العقد التقليدي قائما على أسس مادية مثل لقاء الطرفين و كتابة العقد على ورقة قانونية و ذالك هو العنصر المفقود في العقد الإلكتروني لأن حالة الطرفين فيه لا تسمع باللقاءالجسدي بسبب البعد الفيزيائي و بالتالي انعدام الكتابة في هذه العقود الحديثة.[٣]

إن التكنولوجيا الحديثة زودت الوسائل الإلكترونية بصفة الثقة فكانت مثل الوسائل التقليدية. وأدت هذه الثقة إلى صحة التوقيع الإلكتروني القائم على المفتاح المزدوج المشفر و بالتالي إلى توجه إرادة صاحب التوقيع إلى إصداره.[٤] وقد تتحقق صحة التوقيع الإلكتروني و نسبته إلى صاحبه عن طريق تحديد هويته في سبيل الإلكتروني الذي خزنت فيه معلوماته في السابق في حال إذا كان الطرفان راضين على العمل بهذه الطريقة.[٥]

---

(١) د.حسن عبد الباسط جميعي، إثبات التصرفات القانونية التي يتم إبرامها عن طريق الانترنت، المرجع السابق، ص: ٤٥

(٢) السنهوري، عبد الرزاق أحمد، (١٩٦٤م). الوسيط في شرح القانون المدني، مصادر الالتزام. بيروت: دار النهضة العربية، ص: ١٨٢. ويرى العلامة السنهوري: أن "العقد يقوم على الإرادة، أي تراضي المتعاقدين، والإرادة يجب أن تتجه إلى غاية مشروعة وهذا هو السبب، أما المحل فهو ركن في الالتزام لا في العقد.

(٣) الأبابصيري،عقد الاشتراك في قواعد المعلومات عبر شبكة الانترنت، دراسة تطبيقية لعقود الانترنت، دار النهضة العربية، القاهرة، ٢٠٠٣م، ص: ٣٣

(٤) د.حسن عبد الباسط جميعي، إثبات التصرفات القانونية التي يتم إبرامها عبر الانرنت،المرجع السابق،ص:٤٧

(٥) مشميش،ضياء أمين، التوقيع الإلكتروني:دراسة مقارنة، المرجع السابق،ص: ١٥١

ويرى الباحث أن التوقيع الإلكتروني يمكن أن يعيين هوية صاحب التحرير الإلكتروني إذا كان المفتاح الخاص و العام متماثلان و كان مرتبطا بشهادة التوثيق وبالتالي فإن التوقيع الإلكتروني بشكل عام والتوقيع الرقمي بشكل خاص جزء أساسي في تعبير هوية الموقع و وفقا لذلك فإنه يسمح بتأمين للتعبير الصحيح للإتفاق.

المبحث الثالث: موقف الشريعة الإسلامية من التوقيع الإلكتروني

ومن المعلوم أن في واقعنا المعاصر كثير من الأمور و عديد من الأشياء التي لم تكن موجودة خلال حيات النبي ﷺ حينما ينزل الوحي، بل هي طارئة ومستجدة علينا نتيجة التطور الحضاري، التكنولوجي و التقدم العلمي، و التوقيع الإلكتروني كذلك من مستجدات العصر الحاضر لذلك لايمكن لنا بأن نحكم علي جوازه أو بعدم جوازه مباشرة بل علينا أن نقم أمامه متوقفا حتى توضح لنا سبيل الرشد بعد الخوض في القرآن المجيد والسنة المحمدية على صاحبها الصلاة والسلام التي لاتعد ولا تحصى، وكذلك بعد الفكر العميق في مقاصد الشريعة الغرآء، ولذالك قسمت هذا المبحث على مطلبين اثنين، أخص الأول منه لاستنباط ولاستخراج موقف الشريعة الاسلامية من التوقيع الإلكتروني وفي المطلب الثاني أبين مقاصد الشريعة المتعلقة بالتوقيع الإلكتروني باذن الله تعالى.

المطلب الأول: استنباط موقف الشريعة الإسلامية بالتوقيع الإلكتروني

إنه من المعروف أن الهدف الرئيسي للتوقيع مطلقا بجميع أنواعه هو إثبات المستندات ثم نسبتها إلى أصحابها إضافة إلى التعبير عن رضا الطرفين في العقد ولم تغفل الشريعة عن تلك الأهداف الحساسة فأشار القرآن إلى ذلك في آيات عديدة حيث ، قال جل علاه : ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى فَاكْتُبُوهُ﴾ وقال سبحانه: ﴿وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَى﴾ إلى قوله سبحانه وتعالى: ﴿وَلَا تَسْأَمُوا أَنْ تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَى أَجَلِهِ ذَلِكُمْ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنَى أَلَّا تَرْتَابُوا﴾[1]

ولما أن التوقيع هو رمز التوثيق للمستندات فضمنت النصوص هذا الجانب أيضا و اعتبرت التوقيع دليلا على نسبة المسند لصاحبه ووجه ذلك أن النبي عليه السلام استخدم الختم كتوقيع على

(١) سورة البقرة: ٢٨٢

جميع مكاتباته سواء كانت إلى ولاته و أمرائه أم إلى الملوك و أمراء الأمصار.[١] وتفصيل ذلك لما أخبر النبي ﷺ أن أهل الروم لا يقرءون الكتب إذا لم تكن مختومة ،اتخذ خاتماً يختم به كتبه ورسائله حتى تكون مقبولة وموثوقة للجهة التي يرسل إليها،فعن أنس بن مالك ﷺ قال : "لما أراد النبي ﷺ أن يكتب إلى روم قالوا:إنهم لا يقرءون كتابا إلا مختوماً، فاتخذ النبي ﷺ خاتما من فضة ، كأني أنظر إلى وبيصه ونقشه : (مُحَمَّد رسول الله)" . وكان الخلفاء من بعده يبعثون الرسائل والأوامر مختومة إلى الجهات المختلفة[٢]

ويمكن أن نضيف بعض أهم النقاط إلى ما سبق في شأن الاعتماد على التوقيع الإكتروني وهي ما يأتي:

النقطة الأولى: أن العادة قد جرت بالعمل بهذه الوسائل الحديثة الالكترونية والتوقيع الالكتروني في التعاقدات،حتى كادت أن تكون بديلا عن التعاقدات الخطية المباشرة ،ولا شك أن العادة محكمة ، ولذا يقول الإمام الطحاوي[٣] تعليقا على حديث أنس في اتخاذ النبي ﷺ خاتما لختم كتبه التي يبعثها إلى الفرس والروم:" يستفاد من حديث أنس أن الكتاب إذا لم يكن مختوما فالحجة بما فيه قائمة ؛ لكونه ﷺ أراد أن يكتب إليهم وإنما اتخذ الخاتم لقولهم إنهم لا يقبلون الكتاب إلا إذا كان مختوما".[٤]

فهذا الذي ذكره الطحاوي – رحمه الله – يدل على العرف السائد عند العرب زمن النبي ﷺ هو قبول الكتب من غير أن تكون مختومة،ولكن لما علم النبي ﷺ أن عرف الروم والفرس أنهم لا يقرءون الكتب ولا يقبلونها إلا إذا كانت مختومة اتخذ ذلك الخاتم لهذه الغاية.وكذا الحال بالنسبة لهذا الزمان، حيث جرت عادة التجار الاعتماد على مثل هذه الوسائل الإكترونية والتوقيع الإلكتروني في إجراء معاملاتهم نظراً لما تحققه من مصالح، وتمتاز به من خصائص؛كسرعة الإنجاز، والتوفير في النفقات ،والأمان في الاتصال.

النقطة الثانية: إن المعاملة التجارية عن طريق التوقيع الاكتروني أجازته بها الدول وا لقوانين التنظيمية الداخلية لها ، سواء على المستوى المحلي أو على المستوى الدولي ، ولذا كان الأصل هو انعقاد العقد عن

---

(١) البخاري،مُحَمَّد بن إسماعيل،صحيح البخاري،دار ابن كثير،بيروت،١٩٩٠م، كتاب العلم باب ما يذكر في المناولة، رقم الحديث: ٦٤ – ٦٥

(٢) ابن قدامة،عبد الله بن أحمد بن مُحَمَّد، المغني،تحقيق: التركي، عبد الله بن عبدالمحسن، والحلو، عبد الفتاح مُحَمَّد، القاهرة، دار هجر للطباعة، الطبعة الثانية، ٤٧٢/٨.

(٣) هو أحمد بن مُحَمَّد بن سلامة بن سلمة بن عبدالملك الأزدي، أبو جعفر الطحاوي،انظر:القرشي، طبقات الحنفية ص:١٠٢-١٠٣

(٤) ابن حجر،فتح الباري، ١٥٥/١٣

طريق هذا التوقيع الالكتروني ، فإذا ما ادعى احد الأطراف عدم صحة ما ورد في الوثائق المستخدمة عن طريق هذا التوقيع الإلكتروني ،فإن عليه عبء الإثبات بالوسائل والطرق المشروعة ؛ بناء على قاعدة (البينة على المدعي).[١]

النقطة الثالثة: مما هو مقرر في الفقه الحنفي أن دفاتر البياع والصرف والسمسار يمكن الاعتماد عليها ،واعتبروا ما دوّن فيها من الديون والحقوق حجة مستقلة يعمل بها، من غير أن تكون مصدَّرةً معنونةً،وإنما يكتفي في كتابتها ما جرى عليه العرف التجاري ،بل ذهبوا إلى أن العمل بها إنما هو لموجب العرف لا بمجرد الخط (٢).فكيف بهذه التوقيع الإلكتروني الذي جرى العمل به على المستوى الرسمي بالإضافة إلى ما جرى عليه العرف التجاري ، بل وتمتاز عن دفاتر البياع والصرف والسمسار بأنها تكون مصدرة ومعنونة ومميزة باشارات ورموز خاصة،فلا أقل أن يعتمد عليها في ما يثبته الموقع على نفسه من حقوق للآخرين.

تقسيم الوثائق طبق الفقهاء: أما الفقهاء فقد قسموا الوثائق المحررة إلى قسمين. وثائق رسمية يتراسلها القضاة و الرسميون فيما بينهم و أخرى وثائق عرفية وهي التي تخص الأشخاص على انفراد . و كان للقسم الأول حظا أكبر من اهتمام الفقهاء .

الوثائق الرسمية: لقد اختلفوا في تعريفها فقال ابن القيم: "أن يرى القاضي حجة فيها حكم لإنسان فيطلب منه إمضاءه والعمل به، و يروى عن الإمام أحمد ثلاث أقوال: الأول أنه إذا تيّقن أنه خطه نفذه وإن لم يذكره، والثاني أنه لا ينفذه حتى يذكره، والثالث أنه إذا كان في حرزه وحفظه نفذه وإلا فلا، ويقول ابن قدامة: "وإذا ارتفع إليه خصمان فذكر أحدهما أن حجته في ديوان الحكم، فأخرجها الحاكم من ديوانه فوجدها مكتوبة بخطه تحت ختمه، وفيها حكمه، فإن ذكر ذلك حكم به، وإن لم يذكره لم يحكم به"[٣]، وبه يقول الإمام أحمد في باب الشهادة ويوافق ذلك الإمام أبو حنيفة والشافعي ومُحَمَّد بن

---

(١) القره داغي،حكم 'إجراء العقود بالآيات الاتصال الحديثة،ص ٩٤١،مجلة الفقه الإسلامي ، ع ٦/ج٢.

(٢) في حين أن علماء بلخ أفتوا بحجيتها في الإثبات ، ووافقهم عليها جمهور الفقهاء .انظر :ابن نجيم ، البحر الرائق (٤/٧)،ابن عابدين : ردالمختار (١٣٦/٨-١٣٨)،الزحيلي،وسائل الإثبات (٤٧٥/٢)

(٣) ابن القيم، مُحَمَّد بن أبي بكر، الطرق الحكمية في السياسة الشرعية، تحقيق مُحَمَّد حامد الفقي، دار الوطن، رياض، ص: ١٧٣.

الحسن، ولدى الإمام أحمد أنه يحكم به وهوه مذهب ابن أبي ليلى أيضا،[١] وفي الأخير استطيع أن أقول بأن الوثقية الرسمية هي أمر حاكم إن لم يعلمه لم يصح تنفيذه إلا بحجة مثل أمر الغير. ولأنه يمكن أن يقوم بتزوير توقيعه بخط آخر ولم يكن هذا الموقف من قبل الفقهاء الا من باب الاحتياط الذي يدل على أهمية التوقيع او المحرر الرسمي وإلا فالختم والتوقيع يدويا كافٍ.

الوثائق العرفية: فهو أيضا دليل قانوني يتمتع بصفة الإثبات والتوثيق. إن تم تأكيده بتوقيع من صاحبه أو إشهاد أو ختم أو غيرها من ذرائع الإثبات. و لذا قال بعض الفقهاء: "أن من مات فوجدت وصيته مكتوبةً عند رأسه ولم يشهد عليها وعُرِفَ خطه وتوقيعه فإنه يقبل ما فيها، أو كانت مختومة بختمه".[٢]

وقال آخرون أن الخط المتشابه دليل على ثبوت نسبة الكاتب المحرر. فورد في تبصرة الأحكام:"إذا ادعى رجلٌ على رجلٍ بمال فجحده، فأخرج المدعي صحيفة مكتوب فيها خط المدعى عليه وإقراره بما ادعى عليه، وزعم المدعي أنها بخط المدعى عليه فأنكره المدعى عليه، وليس بينهما بينة، فطلب المدعي أن يجبر المدعى عليه أن يكتب بحضرة العدول ويقابل ما كتبه بما أظهره المدعي فأفتى أبو الحسن اللخمي بأنه يجبر على ذلك، وعلى أن يطول فيما يكتب تطويلاً لا يمكن معه أن يستعمل خطاً غير خطه، والعدول يقابلون ما يكتبه الآن بما أحضره المدعي، ويشهدون بموافقته له أو مخالفته، ورجح أكثر الشيوخ ما أفتى به اللخمي".[٣]

وقرر البعض الآخر أن معرفة الخط دليل على نسبة التحرير إلى صاحبه كما جاء في كتاب تبصرة الأحكام: "ولو كتب[٤] ذلك في صحيفة أو في لوحٍ أو خرقة لزمه إن شُهِدَ أنه خطه"[٥] والجمهور على أن المحرر المنسوب إلى صاحبه بأي طريق كان حجة و دليل من أدلة الإثبات المعتمدة.[٦]

ويرى الباحث أن الفقهاء لم يقيدوا طرق التوثيق في صورة معينة بل وسعوا المجال لذلك مع أخذ

---

(١) ابن قدامة، عبد الله بن أحمد بن مُحَمَّد، المغني ، المرجع السابق، ٥٧/١٤، البهوتي، منصور بن يوسف، كشاف القناع عن متن الاقناع، مطبعة أنصار السنة المحمدية، ١٣٦٦هـ، بدون ذكر بلد النشر، ٢٨٨/٦

(٢) ابن قدامة، عبد الله بن أحمد بن مُحَمَّد ، المغني ، المرجع السابق، (بتغير) ٤٧٠/٨، البهوتي، منصور بن يونس، كشاف القناع عن متن الإقناع، دار الفكر، بيروت، ١٤٠٢هـ، ، ٢٨٣/٤.

(٣) ابن فرحون، إبراهيم بن مُحَمَّد، تبصرة الحكام في أصول الأقضية والأحكام، دار الكتب العلمية، بيروت، ط ١، ١٣٠١هـ، ٣٠٨/١.

(٤) أي لفلان على كذا –كما في الجملة التي قبلها.

(٥) ابن فرحون، إبراهيم بن مُحَمَّد، تبصرة الحكام في أصول الأقضية والأحكام، المرجع السابق، ٥٧/٢.

(٦) ابن القيم، مُحَمَّد بن أبي بكر، الطرق الحكمية في السياسة الشرعية، المرجع السابق ، ص: ١٧٥

نوع المحرر في عين الاعتبار. فكان منهم من ركز على المحرر الرسمي و ذهب الآخرون ليفسحوا المجال للمحرر العرفي في كل ما يثبت نسبة المحرر لصاحبه ويعتبر ذلك حجة كاملة.

وإن ذلك دليل واضح على أن الفقه الإسلامي فاتح مصراعيه لكل وسيلة توثيق حديثة ما دامت تؤدي مهام التوقيع و نسبة التحرير إلى صاحبه.

وهذه هي الصفة المميزة للشريعة الإسلامية عن القوانين الموضوعة من قبل البشر فإنها شاملة في أصولها و ضوابطها تسع جميع ما يشهده العالم الجديد من تطور و تقدم خلاف الأنظمة البشرية التي قلما تتمكن من إيجاد ضوابط ملائمة للمستجدات التي تواجهها بدون إلغاء وترميم و تعديل.

المطلب الثاني: مقاصد الشريعة المتعلقة بالتوقيع الإلكتروني

إن الشريعة كما يقول ابن القيم: مبناها وأساسها على الحكم ومصالح العباد في المعاش والمعاد، وهي عدل كلها، ورحمة كلها، ومصالح كلها، وحكمة كلها، فكل مسألة خرجت عن العدل إلى الجور، وعن الرحمة إلى ضدها، وعن المصلحة إلى المفسدة، وعن الحكمة إلى العبث، فليست من الشريعة، وإن أدخلت فيها بالتأويل، فالشريعة عدل الله بين عباده، ورحمته بين خلقه، وظله في أرضه، وحكمته الدالة عليه، وعلى صدق رسوله، أتم دلالة وأصدقها.(١)

إن المصلحة التي تهدف الشريعة إلى تحقيقها، لا تتحقق إلا بمتابعة أحكامها، وقواعدها، ومبادئها، ومواقفة مقاصدها، ولذلك كان لا بد للمسلم أن لا يغفل المقاصد من مشروعية التجارة بوسائل الإلكترونية عامة والتوقيع الإلكتروني منها خاصة، إذ هي بمثابة الضوء الذي يحدد لنا كيفية التعامل معها وفق ضوابط مشروعة، فضلاً عمّا جبلت عليه النفوس من الميل والإقبال على ما عرفت هدفه وغايته، وأدركت نفعه ومصلحته.

ويجدر التنوية إلى أن المقصد الأهم الذي يجب أن يراعى في كافة التصرفات المالية هو مقصد "حفظ المال"(٢)لأن المال من ضرورات الحياة التي لابد منها لتحصيل مصالح الدنيا والآخرة، والشرع والعقل يؤيدان ذلك، قال تعالىٰ:﴿وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا﴾(٣)، فالفرد محتاج

(١) مُحَمَّد بن أبي بكر المعروف بإبن قيم الجوزية (ت٧٥١هـ)، إعلام الموقتين عن رب العالمين، تحقيق مُحَمَّد محي الدين عبد الحميد، دار النشر وتاريخ الطبع غير مذكور، ١٤/٣.

(٢) ابن عاشور، مُحَمَّد طاهر، مقاصد الشريعة، تحقيق و دراسة: مُحَمَّد طاهر الميساوي دار النفائس، عمان ،١٩٩٩م، ص٤٥٥

(٣) سورة النساء:٥

إليه من حيث إن حفظ حياته متوقف على الأكل والشرب، والملابس الواقية من الحر والقر...إلخ، وكل هذه تتطلب مالاً، فإذا فرض عدم وجوده لَحِق الضرر بالأفراد من هذا الوجه، وكذلك فإن الأمة إذا لم تملك مالاً فإنها تكون فريسة سهلة لأعدائها، وفي ذلك إخلال بمقاصد أخرىٰ كالدين، والأنفس، والأعراض، فوجود المال في يد الأمة يغنيها عن أعدائها ويوصد الباب في وجوه الطامعين بها.(١)

ومما لاشك فيه أن التوقيع الإلكتروني سبب لإكتساب السلع النافعة، وتملكها، وتداولها، والإنتفاع بها دنيوياً وأخروياً، وهذا أمر مقصود للشارع، ومندوب إليه، وليس من شك أن إحصاء تلك المقاصد وحصرها متعذر، أو شبيه بالمتعذر، ذلك أنها تستمد من عدد من المصادر، كالنصوص الشرعية من الكتاب، والسنة، والإجماع، وجملة من مسالك العلة ونحوها من أدلة إثبات المقاصد ومعرّفاتها، بيد أن الباحث سيشير حسب الوسع إلى طرف مناسب من تلك المقاصد التي اعتبرها الشريعة في مجال التجارة الإلكترونية عامة وفي التوقيع الإلكتروني خاصة.

وتتلخص أبرز مقاصد الشريعة في التجارة الإلكترونية عامة وفي التوقيع الإلكتروني خاصة في المقاصد الآتية:

المقصد الأول: الترحيب بالعلم الجديد النافع

فإن من مقاصد الشريعة في تشريع التجارة الإلكترونية والتوقيع الالكتروني بضوابطها ترحيب الإسلام بالعلم الجديد النافع حتى وإن كان من آثار الكفار، فهو جائز إذا لم يكن فيه مفسدة راجحة، وفي ذلك يقول ابن تيمية: "فأخذ علم الطب من كتبهم يعني غير المسلمين مثل الاستدلال بالكافر على الطريق، واستطبابه، بل هذا أحسن، لأن كتبهم لم يكتبوها لمعين من المسلمين حتى تدخل فيها الخيانة، وليس هناك حاجة إلى أحد منهم بالخيانة، بل هي مجرد انتفاع بآثارهم كالملابس، والمزارع، والسلاح، ونحو ذلك.(٢)

المقصد الثاني: تداول السلعة ورواجها

---

(١) البوبى، مُحَمَّد سعد بن أحمد بن مسعود، مقاصد الشريعة الإسلامية وعلاقتها بالأدلة الشرعية، ص:٢٨٣

(٢) ابن تيمية،أحمد بن عبد الحليم، مجموع الفتاوى شيخ الإسلام ابن تيمية، جمع وترتيب، عبد الرحمن بن مُحَمَّد بن قاسم، دار إحياء الكتب العربية، مصر، ، ٧١/١.

ان مقصود الشارع هو أن يكون المال متداولا بين أيدي الناس جميعا، و متحركا في شكل استهلاك أو استثمار، لا أن يكون محصورا بين فئة قليلة من الناس، قال تعالى:﴿ كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ ﴾.[١] الدولة تعني: تداول المال و تعاقبه.[٢]

وعنى هذ المقصد أن الشريعة الاسلامية تنظر الى التجارة الإلكترونية والتوقيع الالكتروني نظر الوسائل التي بحركتها الدائمة تنمو وتنمي غيرها من الموارد و أوجه النشاط الاقتصادي، وقديعبر عن أهمية حركة السلع و المواد ودورانها في المجتمع بأنه كحركة الماء و الرياح، فالماء اذا سكن أسن وتكدر، و بسكون الريح قد يشتد الحر، وتركد السفن، ويقل الهواء الصالح للحياة، فكذلك تجميد المال و تعطيل حركته لا يأتي بالخير لصاحبه ولا للأمة ، وبحركتها تدور عجلة الحياة، وتتجددطبائع الأشياء[٣] كما أن من وسائل تداول الثروة ورواج السلع تسهيل المعاملات بقدر الامكان، و الحكم باباحة الطارئ منها، وترجيح جانب ما فيهامن المصلحة على ما عسى أن يعترضها من مفسدة مرجوحة.[٤]والحكم بمشروعية التوقيع الالكتروني ضمن ضوابط محددة من شأنه تحقيق هذا المقصد بالصورة المطلوبة.

المقصد الثالث: التيسير ومراعات الحاجة:

هذا مقصد عام، وسمة من سمات التشريع الإسلامي وخاصة بالنسبة للتصرفات المالية، فلا تخفى علينا حاجة الناس إلى معاملة بعضهم بعضا، فإن ذلك من لوازم اجتماعهم واستقرار حياتهم؛ لأن حاجة الإنسان تتعلق بما في يد صاحبه غالباً، وصاحبه قد لا يكون حاضراً في نفس البلد، بل قد يكون أحدهما في شرق الأرض والآخر في غربها، وليس ثمة سبيل إلى بلوغ غرضه، أو المتاجرة معه إلا عن طريق الإنترنت أو غيره من وسائل التكنولوجيا المتاحة، ففي جواز التجارة الإكترونية وسيلة إلى بلوغ الغرض المنشود من غير حرج، وبها يستطيع الإنسان أن يتملك شيئاً وأن يكتسب.

والأدلة على اعتبار هذا المقصد كثيرة و متنوعة منها:

---

(١) سورة الحشر: ٧

(٢) ابن عاشور، مُحَمَّد طاهر، مقاصد الشريعة، المرجع السابق ، ص:٤٦٦

(٣) يوسف حامد العلم، "المقاصد العامة للشريعة الإسلامية"الطبعة الأولى،الدار العالمية للكتاب الإسلامي،١٩٩٤م، ص: ٤٩٨

(٤) ابن عاشور،مُحَمَّد طاهر،مقاصد الشريعة، المرجع السابق،ص:٤٦٨

قال الله تعالى:﴿ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾.[١]وقوله تعالى:﴿مَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ ﴾.[٢] فهذه النصوص وأمثالها جلية في الدلالة على يسر هذه الشريعة، ونفي الحرج عنها، وهو وصف للشريعة نابغ من طبيعتها، وسهولة أحكامها.

والقول بجواز التجارة الإكترونية والتوقيع الالكتروني يساير هذا المقصد ويقويه؛ ذلك أن كثيراً من معاملات البيع والشراء والإجارة[٣] أصبحت إلكترونية، فلو قلنا بعدم جوازها للحق الناس حرج وضيق يعكر عليهم صفو حياتهم، فبات القول بجوازها يتفق مع ما ابتنت عليه الشريعة الإسلامية من اليسر، ودفع المشقة، ورفع الضيق المؤدي الى الحرج، ومن هنا قعد العلماء القاعدة المشهورة "المشقة تجلب التيسير"

المقصد الرابع: تحسين فرص التجارة، وتوسيع مداها:

ومن الملوم أن في المجال التجاري توفر للمشترك معلومات وفيرة حول ما قد يحتاج إليه، كدليل تجاري يتضمن الاسم التجاري، والاسم الشخصي، والعنوان، ورقم الهاتف... إلخ، وتصل بين أطراف العرض والطلب، وتسمح بمشاهدة المنتجات المعروضة، كما يمكن أن يتم حوار بين طرفين فأكثر حول بعض العروض التجارية، وصفاتها، وأسعارها، وكيفية تسديد السعر، وشحن البضاعة، بل قد يتم تحويل القيمة عبر الشبكة بوسائل مستحدثة، كما وتمكن الناس في دول العالم الثالث والمناطق الريفية أن يمتلكوا منتجات وبضائع ضرورية ونافعة غير موجودة في بلدانهم الأصلية.

ومن الجدير بالذكر أن ترك استغلال التجارة الإكترونية لغير المسلمين يؤدي ألى انتشار المواد والسلع غير النافعة التي تفسد العقيدة والأخلاق، وبالتالي فإن أي طريق يسهم في نشر مبادىء الإسلام، و إظهار العقيدة الصحيحة بكلياتها، وإبراز عظمة الشريعة، وواقعيتها في معالجة مشكلات الحياة والمجتمع المختلفة، وبيان أن الأخلاق الإسلامية هي الأسلوب الواقعي الصحيح للتعامل بين الناس، لاريب أنه طريق مقصود شرعا، والتجارة بوسائل الإكترونية والتوقيع الالكتروني هي إحدى تلك الطرق.

المقصد الخامس: تلبية فطرة الإنسان

---

(١) سورة البقرة: ١٨٥

(٢) سورة المائدة: ٦

(٣) تقوم العديد من شركات البرمجيات في طرح برامجها للإيجار عبرالإنترنت، مقابل أجرة مالية محددة، وتعتبر فكرة تأجير البرامج الإكترونية عملية و منطقية جداُ، فمن منا لا يرغب في أن يستخدم جميع تطبيقات طقم أو فيس الذي تقدمه شركة مائيكروسوفت مقابل عدة دولارات في السنة.

من الأسس الثابتة التي بنيت عليها مقاصد الشريعة الإسلامية مراعاة الفطرة، والإنسان بطبيعته مفطور على حب التملك كما قال الله تعالى: ﴿وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا﴾.(١) وقد نظم الإسلام هذه الفكرة وهذبها؛ فلم يكتبها ويسلبها كما فعل الشيوعية الشرقية، ولم يطلق لها العنان كما فعلت الرأسمالية، وإنما أعطي كل ذي حق حقه، وأباح التملك وأسبابه ولكن من الطرق العادلة التي لا ظلم فيها ولا جور ولا جشع، وحرم كل طريق من شأنه أن يضاد ذلك كالربا، والغش، والغرر، والسرقة، وبذلك كان المسلمون الأوائل يتنافسون في كسب الأموال وتنميتها لإنفاقها في أوجه الخير تقرباً إلى الله.

والتجارة بوسائل الإكترونية والتوقيع الالكتروني وسيلة شائعة وناجحة في كسب الأموال واستثمارها وتنميتها لذلك يرى الباحث أن في تشريع التوقيع الالكتروني وفق ضوابط شرعية مراعات لطبيعة النفس البشرية وفطرتها؛ ليكون الإنسان بشراً سوياً في أخلاقه وسلوكه، كما كان كذلك في خلقه وتكوينه.

المعقول: والقول بجواز التجارة بوسائل الالكترونية والتوقيع الإلكتروني يتلائم مع فطرة الاسلام المجبولة على حب التملك واستجلاب المنفعة ما دامت في الحدود التي يوفرها الاسلام وفي دائرة الطيبات التي احلهاالله.

قال شيخ الإسلام ابن تيمية: "إن تصرفات العباد من الأقوال والأفعال نوعان:عبادات يصلح بها دينهم، وعادات يحتاجون إليها في دنياهم،فباستقراء أصول الشريعة نعلم أن العبادات التي أوجبها الله أو أحبها،لا يثبت الأمر بها إلا بالشرع، وأما العادات؛ فهي ما اعتاده الناس في دنياهم مما يحتاجون إليه،والأصل فيه عدم الحظر،ولهذا كان أحمد وغيره من فقهاء الحديث يقولون: إن الأصل في العبادات التوقيف؛ فلا يشرع منها إلا ما شرعه الله لنا،وإلا دخلنا في معني قوله تعالى: ﴿أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوا لَهُمْ مِنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَنْ بِهِ اللَّهُ﴾.(٢) والعادات الأصل فيها العفو؛فلا يحظر منها إلا ما حرمه،وإلا دخلنا في معنى قوله تعالى:﴿قُلْ أَرَأَيْتُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ لَكُمْ مِنْ رِزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِنْهُ حَرَامًا وَحَلَالً﴾.(٣)، وهذا قاعدة عظيمة نافعة.

وإذا كان كذلك فنقول: البيع والهبة والإجارة وغيرها من العادات التي يحتاج الناس إليها في معاشهم كالأكل والشرب واللباس، فإن الشرعية قد جاءت في هذه العادات بالآداب الحسنة ؛ فحرمت منها ما فيه فساد،وأوجبت ما لا بد منه،وكرهت ما لا ينبغي، واستحبت ما فيه مصلحة راجحة،وإذا كان كذلك فالناس يتبايعون ويستأجرون كيف يشاؤون ما لم تحرم الشرعية ، كما يأكلون ويشربون كيف

(١) سورة الفجر:٢٠
(٢) سورة الشورى:٢١
(٣) سورة يونس:٥٩

شاؤوا ما لم تحرم الشرعية ، وإن كان بعض ذلك قد يستحب، أو يكون مكروهاً،وما لم تحد الشرعية في ذلك حدّاً فيبقون على الإطلاق الأصلي.[١]

وعلى هذا فإن التوقيع الإلكتروني من المعاملات التي يحتاج الناس إليها في معاشهم ، ولم يرد في منعها أو النهي عنها نص،فتباح استحابا لحكم الإباحة في سائر الأشياء النافعة، والتجارة بوسائل الإلكترونية والتوقيع الإلكتروني منها بلا شك، وهكذا نجد أن حكم المعقول يؤيد ما جاء به النقل قرآناً، أو حديثاً، أو أثراً،وما تم ذكره من أدلة ظاهر وصريح في الدلالة على حليّة التجارة بأشكالها المختلفة، وجوازها في حدود المصالح المعتبرة شرعاً.والله أعلم

المبحث الرابع: نماذج تطبيقية للتو قيع الإكتروني

إنه بدخول الحاسوب إلى معظم دول العالم، فقد تنوعت أشكال وأنواع استخداماته حيث أفرزت التجارة الإلكترونية آليات ووسائل إلكترونية حديثة لم تكن معروفة من قبل تتم عبر شبكة الانترنت دون أي تدخل من قبل الأطراف، ولا يمكن إتمامها إلا بوسائل الإثبات الإلكترونية ومن خلال التوقيع الإلكتروني، وسوف نشير اولا الى حقيقة المعاملات التجارية المعاصرة بشكل موجز ثم نعرض نموذج لأهم وأبرز تطبيقات في هذا المجال:

المطلب الأول: المعاملات التجارية المعاصرة

كان التعاقد في السابق يتم ما بين الأطراف وجهاً لوجه بحيث يجلس المتعاقدين ويتفقا على بنود العقد ويوقعانه، أما في هذا العصر فإن تلك الآلية قد تغيرت كثيراً فأصبح التفاوض على الشراء أو البيع يتم بواسطة الانترنت كما يتم الاتفاق على جميع بنود العقد بدءاً من نوع البضاعة وآلية الدفع والاستيراد والجودة وزمان ومكان التسليم ورسوم الشحن والضرائب وغيرها يتم بواسطة الانترنت، وقد تصل الأمور إلى حد أن المتعاقدين لا يعرفان بعضهما البعض، وكل ذلك لابد فيه من استخدام التوقيع الإلكتروني الذي سبق الإشارة إليه، كي نتأكد أن الموقع على العقد الإلكتروني هو ذات المتعاقد وليس شخصاً يستعمل اسمه وتوقيعه.

ويعرف الفقه التجارة الإلكترونية بأنها "عقد الصفقات التجارية العالمية عبر الوسائل الآلية أوتوماتيكيا باستخدام الكمبيوتر "الانترنت"[٢]، كما تعرف بأنها: "عملية تبادل المعطيات المعلوماتية في مجالات الإدارة

(١) ابن تيمية، مجموع الفتاوى، المرجع السابق،١٣/١٥

(٢) أبو هيبة، د. نجوى أبو هيبة، التوقيع الإلكتروني، تعريفه، ماهيته في الإثبات، مؤتمر الأعمال المصرفية الإلكترونية بين الشريعة والقانون، كلية الشريعة والقانون، جامعة الإمارات،١/٥٤-٥٥

والتجارة والنقل أو عمليات تبادل المعلومات بطريقة آلية تعتمد على التكنولوجيا الحديثة باستخدام وسائل حديثة كالبريد الإلكتروني والنقل والتحويل الإلكتروني للأموال لدى البنوك والنقود الإلكترونية، والبطاقات البنكية والسند الإلكتروني والتلكس والفاكس وإبرام الصفقات."[١]، ويلاحظ أن التجارة الإلكترونية تقوم على النشاط التجاري واستخدام الحاسوب لإبرام عقود هذه التجارة أي استخدام دعامات غير مادية مكان الدعامات المادية وأن هذه التجارة بإمكان الجميع استخدامها عن أي دولة كانت.

وفكرة التجارة الإلكترونية ظهرت على شاشات الانترنت وكثيراً ما نشاهدها، بحيث أصبح هناك مواقع لمعظم الشركات التجارية الكبرى تقوم من خلالها بعرض أحدث منتجاتها وعرض أفضل خدماتها وبإمكان الجميع الدخول إلى هذه المواقع ومشاهدة هذه العروض والبضائع والخدمات وذلك لشراء ما يناسبه منها، فإذا ما اختار شيئاً يقوم بمخاطبة الشركة بواسطة البريد الإلكتروني أو بوسائل حديثة أخرى والتي تقدم له عروضها وأسعارها، فإذا توصل معها إلى اتفاق أبرم العقد معها إلكترونياً، ويتم الاتفاق على آلية الدفع وتسليم البضاعة، ويشار إلى أن الشركات تقوم باستخدام إجراءات معينة كالتوثيق والتوقيع الالكتروني عبر الانترنت للتحقق من شخصية المشتري حتى تكون العملية صحيحة وموثوقة.[٢]

وبعد أن عرضنا حقيقة المعاملات التجارية المعاصرة باختصار، الآن سوف نقدم بعضا من نماذج تطبيقية للتوقيع الالكتروني من خلال المعاملات التجارية المعاصرة التي لا بد منها في حياتنا اليومية والعملية، وهي كالآتي.

المطلب الثاني: نماذج تطبيقية للتوقيع الالكتروني

الفرع الأول: الشيك الإلكتروني

يشبه الشيك الإلكتروني من حيث المضمون الشيك الورقي، فهو التزام قانوني بسداد مبلغ معين في تاريخ محدد لصالح فرد أو جهة معينة، إذ يتضمن الشيك الإلكتروني ببيانات كالمبلغ والتاريخ والساحب والمستفيد والمسحوب عليه، غير أنه يختلف عن الشيك الورقي في الأداة التي يحررها، فهي أداة إلكترونية مثل الكمبيوتر أو الهاتف المحمول وغيرها من الصور، بحيث يتضمن الشيك الإلكتروني توقيعاً منسوباً إلى مصدره، وهذا التوقيع يكون إلكترونياً وباستيفائه لبياناته يكتسب نفس حجية الشيك الورقي وذلك في

---

(١) د. ثروت عبد الحميد ، حجة التوقيع الإلكتروني في الإثبات – مؤتمر الأعمال المصرفية الإلكترونية بين الشريعة والقانون كلية الشريعة والقانون وعرفة تجارة وصناعة دبي – في الفترة من ١٠ – ١٢ مايو ٢٠٠٣م،٨٦/١

(٢) د. الكيلاني، محمود، وسائل التعاقد الإلكتروني وقواعد الإثبات في المسائل التجارية، الملتقى والمعرض الأردني الأول التشريعات المعاملات الالكترونية، عمان، الأردن، ٢٠٠٩م، ص: ٤٩٤.

التشريعات التي أقرت بنظام التوقيع الإلكتروني.[١]، ويتم التعامل بالشيك الإلكتروني من خلال الساحب والمستفيد، غير أنه في كثير من الصورة يلجأ الطرفان إلى طرف ثالث وهو مقدم خدمة الشيكات الإلكترونية، وهنا يقوم العميل بزيارة موقع البائع على إحدى الشبكات الإلكترونية ويطلب شراء بعض ما يعرضه البائع، ثم بعد ذلك يقوم البائع في حال الموافقة بتحويل طلب المشتري بشكل تلقائي إلى الجهة مقدمة خدمة الشيكات الإلكترونية وإخطاره ببيانات التعامل كاسم العميل وعنوانه ورقم حساب وقيمة الصفقة، ثم بعد ذلك يقوم مقدم الخدمة بعرض نموذج للشيك على الشاشة يتضمن كافة بيانات الشيك الورقي، ويقوم بملء كافة البيانات التي تلقاها من البائع من خلال الإخطار المرسل له من قبله، ثم بعد ذلك يقوم بتضمين الشيك توقيعاً إلكترونياً ليقوم المشتري بوضعه، وقد يحتاج مقدم الخدمة إلى التأكد من هوية المشتري بوسائل أخرى، كطلبه وضع رقم هويته الشخصية ضمن البيانات، ويتأكد مزود الخدمة من صحة البيانات المعطاة له، ومن ضمنها كفاية الرصيد وهل هو قابل للسحب عن طريق الاتصال بمصرف المشتري، وفي حال تم ذلك يودع مقدم الخدمة الشيك الإلكتروني لدى البنك المسحوب عليه.[٢]

الفرع الثاني: بطاقات الدفع الإلكتروني

الغصن الأول: بطاقات الائتمان

تعتبر بطاقات الائتمان من أول الصور والوسائل التي استخدم بها التوقيع الإلكتروني.

وهي عبارة عن بطاقات تصدر بواسطة مؤسسة مالية باسم أحد الأشخاص وتقوم تلك البطاقة بوظيفتي الوفاء والائتمان، أي أن حاملها يملك إمكانية تتبع سداد المبلغ الذي استخدمه من الاعتماد المفتوح من جانب مصدر البطاقة.[٣] وتستخدم بطاقات الائتمان في مجالات مختلفة ومتنوعة، فالعديد من البنوك والمؤسسات المالية الكبرى ساهمت إلى حد بعيد في انتشارها وتنوعها، وذلك لأجل تطوير

(١) د. العربي، نبيل صلاح محمود، الشيك الإلكتروني والنقود الرقمية، دراسة مقارنة، دراسة مقدمة إلى مؤتمر الأعمال المصرفية الإلكترونية بين الشريعة والقانون الذي عقدته كلية الشريعة والقانون بجامعة الإمارات العربية المتحدة في الفترة من ١٠-١٢ مايو سنة ٢٠٠٣م، دبي، المجلد الأول، ص: ٦٣

(٢) العربي، نبيل صلاح محمود، المرجع السابق ص: ٦٩

(٣) د. الرومي، محمد أمين، التعاقد الإلكتروني عبر الانترنت، دار المطبوعات الجامعية، الإسكندرية، مصر، ط١، ٢٠٠٤م، ص: ٨٨.

مؤسساتها وتسهيل التجارة بهدف الحصول على الأرباح[١]، حيث بدأ استعمالها كوسيلة وفاء لدى عملاء محطات الوقود والمحلات التجارية الكبرى، وهذه كانت في أول نشأتها ثنائية الأطراف، تقتصر على التعامل مع محطة الوقود أو الشراء من المحل التجاري الذي تولى إصدارها، ولكن سرعان ما عملت المؤسسات الكبرى والبنوك على تطويرها ونشرها على نطاق واسع.[٢]

وهناك أنواع متعددة من بطاقات الائتمان والتي تختلف بحسب الغرض من إصدارها، كما أنه من المحتمل أن تكون البطاقة الواحدة تؤدي أكثر من غرض في آن واحد ولكن الذي يهمنا في هذ المقام هوأن جميع أنواع هذه البطاقات لا يمكن لأحد ان يستعملها أو أن ينتفع بها الا باستخدام التوقيع الالكتروني وأنواعه في حياتنا التجارية المعاصرة .

الغصن الثاني: بطاقة الصراف الآلي أو السحب الآلي

تعتبر هذه البطاقة الأكثر شيوعاً، بموجبها يمكن لصاحب هذه البطاقة سحب مبالغ مالية من حسابه عبر جهاز الصراف الآلي، بحد أقصى يومي أو أسبوعي متفق عليه بينه وبين البنك مصدر البطاقة، تكون عملية السحب من خلال تمرير البطاقة في فتحة خاصة بجهاز الصراف الآلي، ثم بعد ذلك تظهر شاشة أمام الشخص مكتوب عليها اختيار اللغة، وفي حالة اختيار صاحب البطاقة تظهر أمامه على الشاشة عبارة إدخال الرقم السري وهو من اشهر أنواع التوقيع الالكتروني الذي يتكون غالباً من أربعة حروف، وفي حال تم الموافقة من قبل الجهاز على المعلومات المدخلة تظهر شاشة أمام صاحب البطاقة وهي قائمة بالمبالغ الذي يستطيع سحبها في حال كان له رصيد كاف لدى البنك، ولذلك فإن بطاقة السحب الآلي لا تعتبر بطاقة ائتمان لعدم توفير تسهيلات ائتمانية للعميل عادة.[٣] لأنه في حال لم يكن رصيد للعميل في البنك بالمبالغ المنوي سحبها فلا يستطيع السحب لعدم توفر الرصيد.

مما سبق يلاحظ بأن الإيجاب والقبول وانعقاد العقد وما يرافقه من شروط الدفع والاستلام والتسليم والنفقات وغيرها من خلال المعاملات التجارية المعاصرة و العقود الالكترونية وغير ذلك هناك صور جديدة أخرى من المعاملات البنكية وأشبا هها كل ذلك يتم بواسطة الانترنت، أو البريد الالكتروني أو غيرها من وسائل التقدم العلمي الحديث، وجميعها بحاجة إلى التوقيع الإلكتروني، وبالتالي لا يمكن إتمام

(١) رضوان، مُحَمَّد أنس، الأحكام الشرعية لأنواع البطاقات البنكية، بحث ماجستير مقدم عام ٢٠٠٩م، كلية الشريعة والقانون – الجامعة الإسلامية العالمية – إسلام آباد، باكستان، ص: ٩١ وما بعدها بتصرف.

(٢) د. ثروت عبد الحميد ، المرجع السابق ص: ٨٣.

(٣) د. ثروت عبد الحميد ، المرجع السابق ص: ٨٥.

هذه الصفقات إلا بالاستيثاق من التوقيع الإلكتروني الذي حل محل التوقيع التقليدي.

الخاتمة

إن التطور السريع في جميع أشكال الحياة والتكنولوجيا والتجارة بشكل خاص يحتم علينا أن نواكب المسيرة ونسنن القوانين الملائمة مع التغيرات السريعة. فالتوقيع الإلكتروني واحدة من أهم ضروريات الإنسان لا مفر لأحد منها فلا بد أن نجد الموقف الشريعي المناسب لهذه المشكلة وأن نضبطه بقواعد وأسس مدروسة. إن هذه الدراسة حاولت أن تلقى الضوء على هذا الجزء الأساسي من حياتنا الذي قلما يغيب عنه انسان في هذا الزمن وهو التوقيع الإلكتروني الذي غالبا ما حل محل التوقيع التقليدي في كثير من المواضع.

النتائج

١) يميز التوقيع الإلكتروني عن التوقيع التقليدي هو ربطه القوي بالوسيلة الإلكترونية في الوجود وعدمه.

٢) التوقيع الإلكتروني قائم على التقنية الحديثة، ولهذا التوقيع له صور وأشكال متعددة فلذلك تتعدد صور إصدار التواقيع الإلكترونية ولا يلم بها إلا صاحبها ثم تحفظ على الحاسب عبر طرق رياضية معقدة تضمن حفظ المحتوى بشكل آمن ومنظم بحيث يمكن الرجوع إليها عند الحاجة.

٣) الكتابة الإلكترونية من أهم عناصر التوقيع الإلكتروني وهي بمثابة الكتابة والتوقيع الملموسين في الإثبات والحجية كما كان السائد في الماضي ولذا فالتوقيع الإلكتروني دليل كتابي مقبول لإثبات أي تصرف قانوني كما جاء به القانون النموذجي للأمم المتحدة باسم نهج النظير أو التساوي الوظيفي.

٤) التوقيع الإلكتروني القائم على أساس شهادة قانونية موثقة تعتبر له قوة قانونية متماثلة تماما لقوة التوقيع اليدوي.

٥) التوقيع الإلكتروني ينتشر بسرعة في العالم و يلقى قبولا بين الناس

٦) التوقيع الإلكتروني توقيع خاص ومحمي شرعا وقانونا.

٧) التوقيع الإلكتروني مثل التوقيع اليدوي في الأهمية في حياة الإنسان وهو خير بديل للتوقيع اليدوي التقليدي في الإدلاء بالحجة والبرهان مع الاعتراف بوجود بعض الجوانب السلبية له. ويحاول المختصون التغلب عليها عن طريق البحث عن الموقف الشرعي له.

٨) الكثير من البلدان الغربية المتطورة مثل أمريكا وكندا وغيرها أقرت بالقوة القانونية للتوقيع الإلكتروني إضافة إلى الكثير من رجال القانون وبأهمية التوقيع الإلكتروني لما يواجهه العالم من فائض في نسب التجارات و المعاملات الإلكترونية.

٩) إن توفير السلامة الأمنية للتوقيع الإلكتروني من الجانب التقني أمر أكدت عليه أغلبية التشريعات الحديثة لمنح التوقيع الإلكتروني قيمة قانونية مساوية للتوقيع اليدوي.

١٠) إن الشريعة المحمدية قادرة تماما على استيعاب جميع أشكال وصور التطور التكنولوجي بل وقادرة أيضا على إيجاد حلول مقنعة لها مهما كانت الظروف.

التوصيات

١- الاعتراف بمساواة التوقيع الإلكتروني بالتوقيع اليدوي التقليدي طالما أنه قادر على أداء وظيفته بوجه أتم.

٢- اتحاد الدول المسلمة واجتماعها على منصة واحدة لمواكبة التطور التكنولوجي وإيجاد حلول موافقة للشريعة الإسلامية لجميع صور التطور التقني المتجدد يوما بعد يوم.

٣- الدعوة إلى اتباع الشريعة فى جميع المجالات عموما وفى فقه المعاملات خصوصا لضمان الحقوق وحفظها ومنع النظام والخلاف في المجتمع.

ضرورة اتباع المنهج الشرعي وأصوله في قضايا الإثبات والتوقيع الإلكتروني ومن ثم تحرير تصرفات الأفراد في هذا المجال. ضرورة مواكبة التقدم التقني مع الحفاظ على نظم ديننا الحنيف وعاداته وتقاليده في سبيل تحقيق التطور والمساواة في التكنولوجيا. فإن ما ينفع غيرنا قد يضرنا والعكس بالعكس.

❁ ❁ ❁

Cultural Exposure: A Challenge in Translation

Dr. Muhammad Zaid Malik [*]

ABSTRACT

Language is a medium of communication that allows its users to accurately express exactly what they wish to convey. The development of a language is a gradual process that spans centuries; within those long years, cultural, religious and geographic factors play an important role in the formation of words, phrases and idioms, according to the needs and lifestyles of the people speaking that language. Due to these cultural and contextual differences, it becomes difficult for translators to accurately translate words or phrases from one language to the other, without losing the essence of the original text in the process. Literature and language are so closely related to culture that translating idioms or figures of speech often seem to appear nonsensical and ludicrous in the translated language due to the difference in cultural context.

This article will discuss some of the cultural differences between the Arabs and non-Arabs that a translator must be acquainted with. The article will also touch on the nature of translation, what really should be translated– words, texts or meanings? In the end the author will mention some personal experiences in which the comparison between two translators will be made; one exposed to various cultures and the other not so exposed. Analytical, descriptive and inductive methods will be used.

Key Words*: Challenge, Culture, Exposure, Language, Translation.*

[*] Translation Center, King Saud University, Riyadh, Kingdom of Saudi Arabia.

Introduction

Arabs are unique in their culture and language from the rest of the world. They may share their religion with non-Arab nations but still they do not share their culture and language with any nation on the face of the earth. Hence it becomes necessary for any non-Arab translator in general and Pakistani and English translators in particular to have comprehensive study of Arabic language and culture before they undertake the task of translation. During my long stay and mixing up with the Arab world, I came to know about some of the main cultural differences between the Arabs and non-Arabs that may be summarized in the following points:

a- Arabs are very vocal in talking about marriage.
b- Arabs may openly discuss four marriages.
c- Arabs are more straight-forward.
d- Arabs are more generous.
e- Arabs are more preserving of their traditions.

All these realities have their impact on the Arab culture.

Similarly, there are some differences between Arabic and other languages also. For example:

a- Unlike other languages, Arabic has the quality of brevity "al-ījāz" (الايجاز). It may express many things in few words "Jawāmi' al-Kalim" (جوامع الكلم). Hence communicative translation is needed. This need is extremely felt when translating the Holy Qur'an. That's why it is noticed that the scholars who avoided communicative translation resorted to frequent use of parentheses in the text of Urdu translation.
b- The Arabic language is more eloquent and can articulate better than other languages.
c– The Arabic language has some dialects that are spread among the Arab tribes; seven of these dialects are approved by Allah the Almighty also. Hence the Holy Qur'an was revealed in seven dialects (نزل القرآن على سبعة أحرف).

An interesting incident took place during the time of the first Caliph, Abu Bakr, when he sent Khalid bin al-Walid in the Battles of Apostasy "Ḥurūb al-Riddah" (حروب الردة). At one occasion Khalid passed an order to his men. In Arabic he said, "Adfi'ū asrākum" (أدفئوا أسراكم) (meaning to warm up their captives). Some of his men who were from another Arab tribe jumped in a hurry and started killing the captives. Hearing the hue and cry, Khalid came out of his tent and stopped the killing. He then asked who ordered you to kill the captives. They said: you did. Khalid said: I

didn't. They said: didn't you say: "Adfi'ū asrākum" (أدفئوا أسراكم) ? Khalid said: yes, I did. They said: that's what we were doing. Khalid said: I meant that it was a cold night and the captives must have been feeling cold, so I wanted you to give them some warm clothes or blankets for protection. They said: in our dialect "أدفئوا"(Adfi'ū) means "اقتلوا"('Uqtulū) (kill). Khalid had no other option but to forgive his men who tried to obey him but could not understand his orders due to the difference in Arabic dialects. Later, the Caliph paid the blood money for those killed by mistake.(1)

If this is the case of the native inhabitants of Arabian Peninsula and speakers of the pure Arabic language, then how big would be the challenge when there are two entirely different languages and cultures, trying to translate from and to each other's language?

Meaning of Translation

There are several meanings of translation by different scholars. Some of them are as under:

Translation is a craft consisting in the attempt to replace a written message and/or statement in one language by the same message and/or statement in another language. Each exercise involves some kind of loss of meaning, due to a number of factors. It provokes a continuous tension, dialectic, an argument based on the claims of each language. The basic loss is on a continuum between over translation (increased detail) and under translation (increased generalization).(2)

Translation is both an art and a science. Considered an art, it relates to how it is practically done in day-to-day life and on special occasions; being a science, it has definite rules and regulations like those of grammar and logic. For example, a local speaker of a language knows how to speak and apply his language correctly, but to ascertain that he does not make mistakes; he needs grammatical rules and regulations.(3)

Translation is a branch of comparative linguistics, and hence is closely related to philosophy of language and semantic understanding of language "Fiqh al-Lughah" (فقه اللغة).(4)

---

(1) Ibn al-Athīr,' Izzud Dīn, Abū al-Hasan, *Al-Kāmil fi al-Tārīkh,* (Beirut: Dar al-Kitab al-'Arabi,1997AD), 2/213.

(2) Haas, W., *The theory of translation in G.H.R. Parkinson* (Ed.) *The theory of meaning*, (London: Oxford University Press, 1962AD), 88.

(3) Anderman, G., (Ed.), *Translation today: trends and perspectives*, (Clevedon: Multilingual Matters, 2010AD), 59.

(4) Qalandar, Jamil, Dr. Jamil Qalandar is a Professor of Arabic Language and Translation in the Faculty of Arabic, National University of Modern Languages, Islamabad, Pakistan. The author went to his house in Islamabad for interview on October 06, 2011AD.

History of Translation

As long as multiple languages have existed, and the need for inter-cultural interaction has been a necessity, a rudimentary form of translation has also been practiced. The earliest traces of written translations are engravings that date back to 3000 BC in the Egyptian Old Kingdom in the fort of Elephantine that stood before the First Cataract of the River Nile. The need for translation in the West became necessary when the Romans began to gain influence over the culture and religion of the Greeks, in 300 BC. When the West contacted the Muslims of Spain in the twelfth century, once again, translation became an integral part of the integration of the two peoples. Large scale translations took place due to the continuous contact between the languages of two cultures that were vastly different. When the Islamic rule came to an end in Spain, countless scientific and philosophical classics were translated from Arabic by the Toledo School of Translators. Tytler(1) became the first author of a significant piece of work on translation in 1790, stating that 'a good translation is one in which the quality of the original work is so completely transfused into another language as to be as distinctly apprehended and as strongly felt by a native of the country to which that language belongs as it is by those who speak the language of the original work'.(2)

The twentieth century has been called the 'era of translation'(3) or 'reproduction'(4).

Challenges in the Way of Interpretation

The following are points that may be considered as some of the most serious challenges in the way of interpretation:

1- Differences in terminology, psyche, ecology and environment are big barriers in understanding the culture of a particular nation, particularly at the time of translation. Hence, when a native speaker of English language translates the Holy Qur'an without being fully conversant with the philology, phonology, phonetics, and semiotics and syntactic of Arabic language, he leaves behind a gap of understanding. English is totally different from Arabic. The Arabic pragmatics "al-Tadāwuliyyah" (التداولية) is usually not properly

(1) Tytler, Alexander Fraser 1747 – 1813 was a Scottish advocate, judge, writer and historian who served as Professor of Universal History, and Greek and Roman Antiquities at the University of Edinburgh. His book *Essays on the principles of translation* (London: J.M. Dent & Sons Ltd., 1790AD).

(2) Newmark, Peter, *Approaches to translation,* (Oxford: Pergamon Press, 1984AD), 5.

(3) Jumpelt, R. W., *Die Ubersetzung naturwissenschaftlicher und technischer Literatur,* (Berlin: Schöneberg, 1961), 9.

(4) Benjamin, W., *The translator's task,* in H. Arendt (Ed.). *Illuminations,* (London: Cape, 1970AD), 3.

understood by the foreigners; hence they don't understand the idioms and expressions of Arabic. Translation is actually the outcome of all these prerequisites.

2- Phonology is the basic prerequisite for etymology. Phonetics basically tells us the practical usage of a language, which specifies particular meanings. One of the basic phonetic characteristics of Arabic language is its being the language of the letter "al-Dhād" لغة (الضاد). Pronouncing the Arabic alphabets wrongly causes a gap of understanding between a native speaker of Arabic and a foreigner. If a foreigner who is not well-versed in Arabic, pronounces any word with any of these letters "Ṣād, Dhād, Ṭā, Ẓā, 'Ayn, Ḥā, Dhāl, Thā" (ص ض ط ظ ع ح ذ ث) his/her pronunciation is usually wrong. As the Arabic language belongs to the family of phonetic languages, it is almost difficult for the foreigners to pronounce the Arabic alphabets without due practice.

There are some native speakers of English who seriously felt this challenge and tried to face it. The name of Edward Lane (1801-1876) could be mentioned on top of the list who wrote Arabic English Lexicon, after consulting the dictionaries written by the great scholars of Arabic language, like Tāj al-'Urūs by Zabīdī,(1) Mu'jam Maqāyīs al-Lughah by ibn Fāris,(2) Lisān al-'Arab by ibn Manẓūr,(3) al-Qāmūs al-Muḥīṭ by Fayroz 'Ābādī(4) and Fiqh al-Lughah by Tha'labī.(5)

---

(1) al-Zabīdī, Muhammad ibn Muhammad al-Husayni al-Zabīdī, is widely known as Murtaḍā az-Zabīdi. (1145-1205 AH/ 1732-1790 CE). He was a Hanafī scholar, lexicographer, linguist, a grandmaster in hadīth, genealogy, biographies and personal histories (hadīth, ansāb, rijāl). He was a prolific writer. Apart from Arabic, he was proficient in Turkish and Persian. His great book *Taj al-Uroos min jawahir al-qāmūs* (Beirut: Dar al-Fikr, 1994AD). https://www.ilmgate.org/imam-sayyid-murtada-al-zabidi/

(2) Ibn Fāris, Abu Al-Husayn Ahmad was Arab philologist from Qazwīn. His *Mu'jam Maqāyīs al-Lughah* (Cairo: Dar Ihya al-Kutub al-Arabiyyah, 1366 AH). See for details: The Biographical Encyclopedia of Islamic Philosophy https://books.google.com.sa/books?isbn=1472569458

(3) Ibn Manẓūr, Muhammad ibn Mukarram was a Maghrebi Arab lexicographer of the Arabic language and author of a large dictionary called *Lisān al-ʿArab* (*the tongue of the Arabs*).(Beirut: Dar Ihya al-Turath al-Arabi, 1988AD).

(4) Fayroz 'ābādī, Muhammad Ibn Ya'qūb was a lexicographer and was the compiler of a comprehensive Arabic dictionary, called *al-Qāmūs Al- al-Muḥīt.* It was one of the most widely used in Arabic for nearly five centuries. (Beirut: Muassasah al-Risālah, 1993AD). https://en.wikipedia.org/wiki/Fairuzabadi

(5) Al-Tha'labī**,** 'Abd ul-Malik ibn Muhammad, was an Iranian writer, born in Nishapur, Persia. He was most famous for his anthologies and collections

، ومعجم مقاييس اللغة لابن فارس، ولسان العرب لابن منظور والقاموس المحيط للفيروز آبادي و)(تاج العروس للزبيدي .فقه اللغة للثعالبي)

Another great personality is A. J. Arberry (1905-1969)[1] who translated the Holy Qur'an and named his translation 'The Koran Interpreted'. The uniqueness of this translation is that after writing a preface for the translation in the beginning and then after completing over half of the translation, exactly after completing the translation of Sūrah *Ṭā Ha*, he wrote a second preface in which he says:

> *"I think it is justifiable to adopt the unusual procedure of adding a separate prologue to the second installment of a two-volume work. I suppose I shall never again recapture the freshness and excitement of the experience just now completed; the passing months and years will inevitably blur the image; this is the moment, or never, to attempt to record the impact which an unrelenting and concentrated exploration of the Koran has left on my mind and my heart."*

When a non-Arab translator translates the Qur'an once mastering the Arabic language, becomes ready to go far within the understanding of the idioms and expressions of the Holy Qur'an. It is also noted that if he sees any wrong or partial translation of the Holy Qur'an he starts defending it. The same is done by Arberry who responded to the champions of Higher Criticism, including Dr. Richard Bell who undertook to devote many years to his 'critical re-arrangement of the Sūrāhs of the Qur'an. Arberry responded to his work by saying, 'Advancing well beyond the position taken up by the critics of last century, he [Richard Bell] quite literally took the Koran to pieces and put it together again, his scrupulous reconstruction extending as far as individual verses and even parts of verses. As he set up his translation in a kind of tabular form to indicate his views of how the discourse originally ran, it is virtually unreadable; certainly one needs to have some detailed knowledge of the text in order to benefit by the laborious exercise of studying his hard-laboured pages. Bell followed Fluegel's text.'[2] Moreover, it is also seen that the bias which the West cherishes

---

of epigrams. Of the twenty-nine works known to have been written by him, the most famous is his *Kitāb Yatīmat ud-Dahr*, on the poets of his own and earlier times, arranged according to the countries of the poets, and containing valuable extracts (published at Damascus, 4 vols., 1887). https://en.wikipedia.org/wiki/Al-Tha'alibi

(1) Arthur John Arberry was a respected British orientalist. A prolific scholar of Arabic, Persian, and Islamic studies https://en.wikipedia.org/wiki/Arthur_John_Arberry

(2) Arberry, Arthur John, *The Koran interpreted*, (New York: The Macmillan Company, 1955AD), 18-19.

about the Arabic language prevents them from objective and in-depth understanding thereof. They just presume that the Arabic language does not have the aptitude to deal with the issues related to the scientific discipline of human beings.

It could be the same bias that led an American man of religion (Terry Johns of Gainesville, Florida),(1) to burn the Holy Qur'an. Had he possessed in-depth knowledge of the Arabic language, along with some sense of respect for 'others', he would have never done that. Rather it is recorded in an interview that Terry confessed he never read even the translated Qur'an as a whole.

Then during the last century, there were many men of letters who also tried to bridge this gap between the East and the West by translating the Holy Qur'an in an authentic manner, for example, to cite a few, George Sale,(2) Dr. Rodwell,(3) Palmer,(4) Pickthal,(5) Hāfiẓ Sarwar(6) and Abdullah Yūsuf 'Alī.(7)

---

(1) He burned the Holy Qur'an on Sunday, the 20th of March, 2011. For details see: https://www.youtube.com/watch?v=4HnXd5_Cl90

(2) George Sale was an English orientalist and practicing solicitor, best known for his 1734 translation of the Qur'an into English. He was also author of *The General Dictionary*, in ten volumes. https://en.wikipedia.org/wiki/George_Sale

(3) John Medows Rodwell was a friend of Charles Darwin while both matriculated at Cambridge. He became an English clergyman of the Church of England and a Non-Muslim Islamic scholar. Rodwell's Qur'an translation *The Koran* was first published in 1861.
https://en.wikipedia.org/wiki/John_Medows_Rodwell

(4) Edward Henry Palmer known as E.H. Palmer, was an English orientalist and explorer. During his residence at St John's he catalogued the Persian, Arabic and Turkish manuscripts in the university library, and in the libraries of Kings and Trinity.

(5) Muhammad Marmaduke Pickthall (born Marmaduke William Pickthall, 7 April 1875 – 19 May 1936) was a Western Islamic scholarnoted for his English translation of the Qur'an (1930). A convert from Christianity, Pickthall was a novelist, esteemed by D. H. Lawrence, H. G. Wells, and E. M. Forster, as well as a journalist, headmaster, and political and religious leader. He declared his conversion to Islam in dramatic fashion after delivering a talk on 'Islam and Progress' on 29 November 1917, to the Muslim Literary Society in Notting Hill, West London.
https://en.wikipedia.org/wiki/Marmaduke_Pickthall

(6) Hafiz Ghulam Sarwar a translator of the holy Qur'an in English, from Lahore, Pakistan. https://www.geni.com/people/Hafiz-Ghulam-Sarwar-English-Quran Translation/ 60000000 16777531223

(7) Abdullah Yusuf Ali, was a British-Indian barrister and scholar who wrote a number of books about Islam and whose translation of the Qur'an into English is one of the most widely known and used in the English-speaking world. He died in London in 1953.
https://en.wikipedia.org/wiki/Abdullah_Yusuf_Ali

3- The science of semantics has already been dealt with by Muslim scholars. For example, the book "Mukhtaṣar al-Maʻānī" "مختصر المعاني" by Allama Saʻd al-Dīn Taftāzānī (d. 1339). In this book he wrote many usages of one word, for example the usages of the word "aḍ-Ḍāl" (الضال). He says that it means the one who went astray, as in "wa la aḍ-Ḍālīn" (ولا الضالين). It means the one who is lost, as in "Ḍalla al-Ṭarīq" (ضل الطريق). It means the one about whom people are in oblivion, as in "wa wajadaka ḍāllan fahadā" (ووجدك ضالا فهدى). It also means the one who disappears, as it is said "Laqad dalla waj'huki fi dafā'irikī kamā yaḍillu al-Badru fi al-ghuyūm" (لقد ضل وجهك في ضفائرك كما يضل البدر في الغيوم), which means 'your face has disappeared in your braids as the full moon disappears in the clouds'.

Arabic is called the language of al-Ḍād (لغة الضاد), that is, a language with the problematic letter of al-Ḍād (الضاد), too difficult to pronounce by the non-Arabic speaking community. It is also called the language of al-Aḍ'dād (لغة الأضداد), that is, the language of similar words with contradictory meanings. For example, the word "qisṭ" (قِسط) means justice. From this root the word "al-Muqsiṭ" (المقسط) is derived which means the just. From the same root the word "al-Qāsiṭ" (القاسط) is derived which means the unjust. Al-Jāḥiẓ [1] wrote on this subject his famous literary and linguistic book entitled: "al-Maḥāsin wa al-Aḍ'dād" (المحاسن والأضداد).

4- Then there is another linguistic aspect that is worth considering, as it determines the meaning of a word, and that is preposition. For example, if we say: I have discussed the issue, its Arabic would be: "Bahathtu al-Qaḍiyyah" (بحثت القضية), and if we want to say: I have probed the issue, its Arabic would be: "Bahathtu fi al-Qaḍiyyah" (بحثت في القضية)and if we want to say: I have searched the issue, its Arabic would be: "Bahathtu 'an al-Qaḍiyyah" (بحثت عن القضية) .

There are many phrases and idioms in Arabic language that are usually not understood properly by the non-Arabs. A linguistic environment is needed in this case. One should live the Arabic language for mastering its deep aspects.

---

(1) ʿAmr ibn Baḥr al-Baṣrī an Arabic prose writer and author of works of literature, Mu'tazili theology, and politico-religious polemics. His famous book *Al-Mahasin wa al-Aḍdād,* (Cairo: al-Matbaʻah al-Jamaliyyah, 1330AH). https://en.wikipedia.org/wiki/Al-Jāḥiẓ

Principle of Similar Effect in Translation

It is unanimously agreed that the translator's main goal while translating is to relay the essence of the content into the translated language. The effect brought about on the readers of the translated text should be as similar as possible to the effect of the original text.(1) Also, the translator should cater to the needs of different audiences by varying the translation of the same text for different audiences. This can be successfully done by keeping in mind the psychological aspect of that audience – how someone that belongs to a particular group thinks, feels and behaves.(2)

Comprehension and Formulation

The success of the process of translation is dependent upon the interpreter's ability to master two techniques: comprehension, which involves understanding and interpreting the text, and formulation, which refers to designing or recreating the new text. (3)

The translation theory

The translation theory is applicable universally since it touches upon so many different aspects of the subject. It attempts to be useful by encouraging the translator to write better and suggests points of agreement on common translation problems.

The translation theory suggests that there is a certain correlation between thought, meaning and language. It proposes the idea that language and behavior have certain universal, cultural and individual aspects. Understanding these cultural and psychological factors may help translators in interpreting texts.(4)

Interpretation

The translator is left with the task of interpretation when a crucial part of the text - that contains the crux of the writer's message, is not very clear semantically. In fact, there have been numerous cases in the history of translation where translators failed to correctly interpret and represent the idea of the translated text, owing either to their own incompetence or due to the current cultural climate. Generally, translation is written in modern language, which acts as a lexical image of the culture associated with that language.(5)

---

(1) Rieu, Emile Victor, *Translation,* in *Cassel's encyclopedia of literature*, (London: Cassel, 1953AD), 41.

(2) Newmark, Peter, *Approaches to translation*, 17.

(3) Garvin, Paul, *A Prague school reader on aesthetics, literary structure and style,* (Washington D.C.: Georgetown University Press, 1955), 27.

(4) Levin, Samuel, R., *The semantics of metaphor.* (Baltimore, MD: Johns Hopkins University Press, 1977), 89.

(5) Newmark, Peter, *Approaches to translation*, 19.

Interpretation is an arduous and tedious task for the translator. When a translator is presented with a text of the past, or of a distant or primitive culture, it becomes especially difficult for him to examine the many layers of lexical development; this includes the cultural significance of mythology, religion, symbols, superstitions as well as the origins and use of metaphors, idioms and abstract ideas.

The key method of making interpretative translation successful is to adopt a semantic technique of translation where the translator is highly skilled and learned in the source language culture and can fully explain the content of the text. As for the target language reader, a mere cursory glance will suffice.

Two Methods of Translation

There are two main methods of translation; communicative and semantic. Communicative translation, as its name suggests, focuses on communication. It aims to communicate or relay an effect on the readers of the translated text as close as possible to the effect of the original text. Semantic translation, on the other hand, focuses on conveying the exact meaning of the original text in the target language. It aims to do this by following semantic and syntactic structures and translating according to the exact contextual meaning of the original.(1) Semantic translation, which is generally an individual's translator's forte is often referred to as an art, whereas, communicative translation, usually the result of a team of translators is a craft.

There are a number of elements that set the two methods apart. Communicative translations generally cater to the reader of the target language, who expects to be met with an integration of foreign elements into his/her native language. Semantic translation, on the other hand, aims to protect the original culture, but may be difficult for readers of the target language to fully comprehend due to connotations of the source language.(2)

According to some translation scholars, communicative translation is preferable to semantic translation. This is because semantic translation, in the attempt to interpret and relay literal and contextual meanings often results in the loss of intended meaning, rendering it inferior to the original text. In contrast, communicative translation aims to write an even better piece than the original text. This is possible because the translator is at liberty to correct possible mistakes in the original by improving logic, replacing clumsy phrasing with elegant words, removing obscure and

(1) Newmark, Peter, *Approaches to translation*, 19.
(2) Ibid, 20.

repetitive elements and modifying faulty syntax. In semantic translations, such modifications are not applicable.(1)

But this view is an exaggerated one, since the science of semantics deals analytically with the meanings of words, phrases, idioms, and syntax of the original language, and as such it is and should be the basis for communicative translation which is impossible without semantic probe of the original language.

Since a communicative translation is theoretically a subjective process in the sense that it is psychologically oriented and is more concerned initially with achieving a definite effect on its readers' minds by taking liberty with it to adjust itself to their expectations and their mental and emotional make-up, hence, a lot of objectivity and impartiality is lost in the process. Moreover, communicative translation may be a useful tool in oratory, especially at political or religious stage, whereas it fails to do justice to language expressions of purely scientific and empirical nature. It is then the semantic translation, which comes to the forefront to do its job objectively and seriously without tempering or interfering with the original text merely to mold and adjust its meaning to make a psychological impact on the readers. That is why communicative translation simply gives semantic translation another dimension by adjusting and rendering the thought and cultural nature of the original more accessible to the reader – a linguistic manipulation called "the pragmatic element" in the Leipzig School. Peirce and Morris define "pragmatics" as the branch of semiotics dealing with the relation between linguistic signs/expressions and their users, that is, transmitters and receptors.(2)

Communicative translation is said to be concerned chiefly with the receptors, normally in a linguistic context and cultural diversity, whereas semantic translation is mainly concerned with the transmitter as an individual. Communicative and semantic both aspects are however, regarded as divergent refinements/revisions of cognitive translations.(3)

Nature of translation

What exactly should be translated from one language into another? Words, text or meanings? I think words lead to the text and the text to the meanings. What really need to be translated are the meanings.(4)

Comparison between two translators; one exposed to the diverse cultures and the other not so exposed

Example of a translator exposed to diverse cultures

(1) Ibid, 21.
(2) (Qalandar, Jameel, 2011, personal interview).
(3) Ibid.
(4) Newmark, Peter, *Approaches to translation*, 37.

In 1982 the ex-president of Pakistan General Muhammad Ziyā ul Ḥaqq visited the Islamic University of Madīnah. I was a student there. My father was a professor and head of Translation Department there. He had to translate the speech of the president. Ziyā ul Ḥaqq first spoke a few sentences, and then my father translated them. In few minutes, Ziyā ul Ḥaqq was unable to catch the train of his thoughts as he was talking extempore, so he asked my father to let him deliver his full speech and take notes then translate the main points in a summary. He spoke for 10-12 minutes in Urdu but the summary translation of his speech made by my father was in 20 minutes. I felt that Ziyā ul Ḥaqq knew some Arabic because he praised the good translation of my father. Actually his comments to my father were:

> *"Dr. Murtazā! I am sure that your translation was better than my speech."*

Later I was informed by some of my colleagues who read Ziyā ul Ḥaqq's CV that he spent couple of years in Jordan for military training as he led the Pakistani training mission in Jordan in 1970. That could be the reason for his understanding of Arabic and the same could validate his judgment upon my my father's translation. The point that is being made here is, my father was exposed to the Arab culture, lived among them for years; hence, he was successfully able to face the cultural difference and convert the source language into target language.

Example of a translator not exposed to diverse cultures

In 1992 a delegation came to Pakistan to hire some teachers for the girls' colleges in Saudi Arabia. They hired a translator who had never been to any Arab country. They had to stay for one week and conduct interviews. The translator had to translate the interviews. He was unable to translate the word "khārij dawām" (خارج دوام)which means over time.

One of the members of selecting committee knew me personally and asked me to come and help them in translation.

Similarly in another interview translation of the physicians a translator was unable to translate the word "al-'ādah al-Shahriyyah" (العادة الشهرية)which means the monthly cycle of menstruation.

Values that may stop us from translating a specific feeling

From 2000-2006, I served as an Imam in an Islamic Center in Florida, USA. During this time the Imam of Masjid al-Nabawi, Dr. Husain 'Āl- al-Shaykh, visited us. He spent 2 days with us and had long discussions and lectures on several issues. I translated his speeches to the community from Arabic to English. On one occasion when I was translating him, he praised me during his speech that the community has a highly learned Imam. It was difficult for me to translate this passage. So noticing this, another person came forward and translated the same.

Technical hitches and problems that a translator faces while undertaking the task of translation

A translator's job is far from simple; during the process of translation, he/she may face numerous problems – some general and some practical. Some general problems are mentioned below:

Some General Problems

A translator faces some general problems that are related to the him/herself or to the environments, he/she has. The following are some of the most important general problems:

1- Lack of Expertise: The translator must fulfill some pre-requisites for the task of translation.
   a. He must be an expert in both the source language – the original language which he is translating, and the target language – the language to which he is translating.
   b. The translator should be learned and well aware of the particular subject of the content that is to be translated, since every field has distinct jargon, vocabulary, linguistic formations and style.
2- Unavailability of good dictionaries that may facilitate translators.
3- Lack of attention, concern and notice displayed towards the translation and the translators, both from higher-ups and the general public.
4- Poor coordination between various translation centers which makes it difficult to keep track of which work has been translated and which is yet to be translated.
5- Low level of Arabic language knowledge among the translators. A mere acquaintance with languages does not qualify one to become a translator. Rather, a translator is characterized by mastery in both languages.(1)

Some Practical Problems

Before the translator embarks on the process of translation, he must ensure that he understands the text. Once he has done that, he can proceed to select an appropriate translation method. Some possible criteria are suggested here:

1- The intention of a text: The translator must be honest and truthful in his work. He must bear in mind the intention of the author and attempt to display that in the translated work.
2- The intention of the translator: The translator must first identify his own intention in terms of the translation work. Is his main goal

---

(1) Malik, Muhammad Zayd, "The problems faced by a translator", Biannual Research Journal: *Al-Īḍāḥ*, Shaykh Zayed Islamic Centre, University of Peshawar, Issue 24th, (June, 2012), 55.

ensuring that the translated piece retains the essence of the original and manages to portray the same message as the original by catering to the same emotional and persuasive charge? Is his aim to spread the culture of the source language through the translated text? Or is he addressing an uninformed audience, who is not well-aware of the source language context and must be educated about any cultural or institutional term mentioned in the text?(1)

3- The reader and the setting of the text: The translator must also inquire about the audience. A member of which socio-economic class, age group, sex, race, educational level or religion is more likely to read the text? Is he/she knowledgeable or ignorant, a layman or an expert?

4- The quality of the writing and the authority of the text: For any piece of writing, the quality of writing and the popularity and credibility of the author increase the value of the text. If the source text is well written and the author is a well-recognized authority on his subject, the translator has to take extra care to accurate translate every tinge of the author's meaning. Also, if the source text contains a number of cultural and societal references that may not be common knowledge to speakers of other languages (such as in novels or historical texts), the translator must make the difficult decision of choosing whether to provide supplementary information for the reader, or not.(2)

5- **Qualities of a good and successful interpreter:**

There are several qualities that a person needs to adopt to be a good interpreter.

two of them are:

1- The translator should aim high to gain expertise in both the source language and the target language. For example, Arabic and Urdu languages, differ in their basic grammars and rules of syntax.(3) To successfully translate between the two languages, a translator must take care of these delicacies.

2- Instead of attempting to translate an idiom or proverb from the source language word by word, the translator should find a similar meaning idiom or proverb from the target language.

---

(1) Neubert, A., Pragmatische aspecte der ubersetzung in *Gundfragen der ubersetzungswissenschaft*, (Leipzig: VEB Verlag Enzyklopadie, 1968AD), 81.

(2) Newmark, Peter, *Approaches to translation*, 34.

(3) Khan, Painda Muhammad, (tr.) *Sifting the sands of Sahara*. (Rawalpindi: Hy-Line Printers, 2005AD), 21.

3- He should be aware of the traditional difference between the peoples of source language and target language.

It can be said that the real challenge for a translator is not the expertise he has to gain in various languages, but the recognition and understanding of different cultures and civilizations. Language symbolizes culture more than anything else; literature is inevitably tied to cultural contexts making it near impossible to separate the two. This is why I proves to be so challenging for translators to literally relay idioms and figures of speech in another language. What may sound perfectly acceptable in the source language may sound like gibberish in the target language.

Here I may give an example of personal experience. I worked for some time in the eastern region of Saudi Arabia. My immediate boss was an Egyptian, Mr. Adil, who was a nice man. It was Ramadhan when he invited me (a Pakistani) along with two Egyptian colleagues over for Ifṭār at his house. When we sat in his drawing room, his ten-year-old daughter came in and shook hands with all of us. One of my Egyptian colleagues started talking to her and said:

"ما شاء الله عليك يا عروسة، كيف حالك؟ اسمك ايه؟ ايش رايك أجوزك؟

خلاص بقى، أنا أجوزك"

Ma sha Allah ʻAlayki yā ʻArūsah, kayf ḥāluki? Ismik ayh? Aysh ra'yuki agawwizik? Khalas baqa, anā agawwizik

"Wow, you are so beautiful, you are like a bride, how are you? What is your name? Tell me, what if I marry you? All right, I will marry you."

Hearing this I got scared and thought that a fight will break out between him and her father, but I was astonished that her father was smiling. There I felt the difference between the two cultures. It was big like a gulf.

I had another experience long before this one, when I was a young student in the Islamic University of Madīnah. As I mentioned earlier my father worked there as an Assistant Professor and head of Translation Department. There were some Egyptian translators working under him. One of them used to welcome me warmly. Whenever I went to my father's office he met me with open hands by saying "da joz bintī" (دا جوز بنتي) (This is my son in-law). He used to introduce me to his friends also in the same way.

To my understanding, this was because of some serious dissimilarities between the Egyptian culture and the Pakistani culture and I am 100% sure that the Egyptians do not introduce any person like that. That man knew me and my father for years and that could be the reason for this frankness but still every time he introduced me like this my face turned red out of shyness. In translating episodes like this, word by word translation may not be appropriate

and only the theme could be translated, leaving aside much of the outward form.

Suggestions

1- The field of translation desperately requires unified centers for translation which are affiliated with various higher education institutions around the world. These centers can act as relay stations which can keep readers up-to-date through quarterly publication about latest translation work around the globe. Since translation is so closely tied to the study of cultural variations, a special issue could be published on how the major nations of the world differ culturally.

2- The training of translators should be the first and foremost job of the aforementioned translation centers, to ensure that the translation field produces authentic and accurate work. The training should be specialized by focusing on various fields of arts and sciences. Various workshops, seminars and interactive lectures could be arranged to shed light on cultural differences between the source language and target language communities.

3- The field of translation should receive appropriate recognition and encouragement from the government so that translators may receive greater means to produce a high level of professional work. Providing motivation and incentives to translators may also develop the field and promote it to the status of a trade.

Conclusion

Translation is a field which involves a great deal of creativity, especially since it involves the meeting of different cultures. Like an artist, a translator must ensure that the essence of the original text is captured and accurately portrayed, without paying much attention to the superficial form of the text.

An artist puts together various ingredients to create an artistic masterpiece but the end product is viewed as a whole painting or sculpture, not a sum of the many ingredients used to create it. Similarly, a translator translates the original text, but it is not each word of the source that pops out, rather it is a comprehensive end product that does not interfere with the intent or essence of the source, but still manages to maintain its own originality.

Therefore, it is imperative for a translator to acknowledge, identify and then illustrate the artistic elements of the two languages as well as the two different cultures that those languages represent.